مظہر امام
اکثر یاد آتے ہیں

اکثر یاد آتے ہیں

مظہر امام

ادب پبلی کیشنز ۔ نئی دہلی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۳ء
کتابت : ابوالکلام عزیزی
طباعت : Printed at Nice Printing Press
New Delhi-110051
ناشر : ادب پبلی کیشنز
۳۶۲ اے، چراغ دلّی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷
قیمت : ۷۵ روپے

AKSAR YAAD AATE HAIN
(Sketches) MAZHAR IMAM

Har-Anand Publications
362 A, Chirag Delhi, New Delhi - 110 017

... جو اکثر یاد آتے ہیں

پیش لفظ

ہندوستان میں آزادی کے بعد ایک نئے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہو چکا ہے جس میں ا
تمام ہندوستانی زبانیں شریک ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں ایک نیا ادب لکھا جا رہا ہے
اور نئے نئے فکری کارنامے سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن اچھی کتابوں کی اشاعت میں اب بھی
طرح طرح کی دقتیں ہیں اور معیاری کتابوں کو چھپوانے میں مصنّفین اور شعرا کو طرح طرح کی
مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اردو زبان کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں، لیکن یہ
بھی حقیقت ہے کہ اردو ہندوستانی زبانوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ پاکستان میں
بھی اردو زبان کی خاصی اہمیت ہے۔ اردو زبان علاقائی ثقافتوں میں اشتراک، اتحاد اور
رفاقت کا وہ رابطہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا چلن
برصغیر کے باہر بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ نئے حالات نے اردو کے لیے نئے چیلنج پیدا کر دیئے
ہیں۔ نئے مطالبات کا سامنا کرنے اور اردو کو ترقی دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ معیاری
کتابوں کی اشاعت کو فروغ دیا جائے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ادب پبلی کیشنز کے تحت
'ہرآنند' نے اردو کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے۔ اس اشاعتی پروگرام کے لیے
ایک دس رکنی ایڈیٹوریل بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے، جو نمائندہ ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل
ہے۔ اس میں ہندوستان و پاکستان کے علاوہ برطانیہ، کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز
ادیب و دانشور شامل ہیں۔ اشاعتی پروگرام میں ذیل کی شقوں کو ترجیح دی جائے گی:

۱۔ اعلیٰ شعری اور نثری ادب کے جامع انتخابات
۲۔ شعرا اور مصنفین کی بہترین تخلیقات پر مبنی کتابیں
۳۔ سوانح نیز خود نوشت سوانح حیات

۴۔ تحقیقی، تنقیدی اور علمی کتب

۵۔ خواتین کی کتابیں اور خواتین کے مسائل سے متعلق کتابیں

۶۔ بچّوں کا ادب

۷۔ اعلیٰ درجے کے ناول، افسانے، ڈرامے اور شعری مجموعے

اردو کتابوں کے پہلے سیٹ کے طور پر ذیل کی کتابیں مارچ ۱۹۹۳ء تک منظرِ عام پر آ رہی ہیں:

۱۔	رام لعل کے بہترین افسانے	رام لعل
۲۔	منشا یاد کے بہترین افسانے	امجد اسلام امجد
۳۔	چانکیہ کی ارتھ شاستر کا اردو ترجمہ	ڈاکٹر شان الحق حقی
۴۔	عورت مرد کا رشتہ	کشور ناہید
۵۔	جزیرہ	جتیندر بلّو
۶۔	اردو اور سیکولرزم	اقبال احمد خاں
۷۔	اکثر یاد آتے ہیں	مظہر امام

زیرِ نظر کتاب " اکثر یاد آتے ہیں " جناب مظہر امام کے لکھے ہوئے خاکوں اور شخصی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو شاعری میں مظہر امام ایک مقتدر اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ نثر نگاری کے میدان میں بھی وہ اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین خاصے بحث انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ اپنے ادبی اور تخلیقی سفر میں جن شخصیتوں کو انھوں نے قریب سے دیکھا یا جن کی صحبتوں کا فیض اٹھایا یا جن کے کسی نہ کسی پہلو سے متاثر ہوئے ان کی روداد زیرِ نظر کتاب کی تحریروں میں یکجا کر دی گئی ہے۔ ان میں کئی باتیں ایسی بھی ہوں گی جن کا تذکرہ کہیں اور نہ ملے گا۔ ادبی تاریخ کی تشکیل میں شخصی مضامین کی بھی اہمیت ہے اور خاص طور پر جب ان کا لکھنے والا خود ایک جہاں دیدہ ادیب و شاعر ہو اور سرد و گرم زمانہ سمو چکا ہو۔ امید ہے یہ کتاب قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

(پروفیسر) گوپی چند نارنگ
چیئرمین، اردو ایڈیٹوریل بورڈ
ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی

جگر مرادآبادی

جگرؔ صاحب کا نام بچپن سے ہی سنتا آیا تھا۔ میٹرک کا طالب علم تھا جب اپنے بڑے بھائی جناب حسن امام دردؔ کے اصرار پہ پہلی دفعہ کسی مشاعرہ میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ مجھے اس وقت تک شاعری، مضمون نگاری وغیرہ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید اس لئے کہ مجھ میں لکھنے لکھانے کی کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بھائی صاحب چھُپ چھُپ کر افسانے بھی لکھتے اور شعر بھی کہتے۔ میں اماّں سے اس کی شکایت کیا کرتا۔ اور اسکول کی درسی کتابوں سے بے توجہی برتنے پر اُنھیں ڈانٹ پلوا کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بھائی صاحب جانتے تھے کہ اُنھیں مشاعرے میں تنہا جانے کی اجازت نہیں مل سکتی اس لئے انھوں نے بہلا پھُسلا کر مجھے بھی چلنے کو رضامند کیا اور میرا سہارا لے کر اماّں سے اجازت لی۔ مشاعرے کے لئے جگرؔ صاحب کا ایک مصرع بہ طور طرح دیا گیا تھا :

'نا دیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں'

اِس غزل کے ایک شعر نے عوام میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کر لی ہے :

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیۓ جارہا ہوں میں

اس غزل کا ایک اور شعر بہت مشہور ہوا جسے اردو کے عمدہ اشعار میں شمار کرنا چاہیے:

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جارہا ہوں میں

میرے نیم پختہ ذہن پر مشاعرے سے کس کس طرح کے اثرات مرتب ہوئے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ دوسرے ہی دن میں نے اسی طرح پر ایک غزل لکھنے کی کوشش کی۔ اگر میں اپنے پرانے کاغذات تلاش کروں تو شاید وہ غزل بھی اپنی اصلی شکل میں مل جائے لیکن اس کے اشعار یہاں پیش کر کے میں آپ سے اپنی ہنسی کیوں اُڑواؤں؟

اتنا ہی نہیں، بلکہ اس مشاعرے کے بعد مجھ میں پہلی دفعہ درسی کتابوں کے علاوہ بھی کچھ لکھنے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی، اور کچھ دنوں بعد جب اسکول میں گرما کی تعطیلات ہوئیں تو میں نے ایک ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں کم و بیش تیس چالیس ناول ختم کیے جن میں زیادہ تر فضل بک ڈپو کے جاسوسی ناول تھے یا پھر عبدالحلیم شرر کے نیم تاریخی ناول۔ میں نے اسی دوران میں ۲۱ طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ جی ہاں، اکیس! بس سمجھ لیجیے، وہ افسانے کیسے رہے ہوں گے!!

مختصر یہ کہ مجھ میں ادبی ذوق پیدا کرنے اور مجھے شاعری کی طرف راغب کرنے میں کسی نہ کسی طور پر جگر صاحب کا بھی حصّہ ہے، یہ اور بات ہے کہ جگر صاحب آخر وقت تک اس حقیقت سے بے خبر رہے۔

جگر صاحب کی دو غزلیں میٹرک کے نصاب میں شامل تھیں، جن میں سے ایک تو وہ تھی جس کا مطلع ہے:

کسی نے پھر نہ سُنا درد کے فسانے کو
مرے نہ ہونے سے راحت ہوئی زمانے کو

اور امتحان میں ایک دفعہ اسے میر درد کا مطلع سمجھ کر میں نے تشریح میں غلطی کی تھی۔ انھیں دنوں یا اس سے کچھ پہلے "مدینہ" بجنور میں ان کی غزلیں باقاعدگی سے پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ اُس وقت "مدینہ" اردو کا بڑا معیاری اور مقبول اخبار تھا۔ جگر صاحب کی مشہور غزلیں یا نظمیں (جگر صاحب نے ان مسلسل غزلوں کو نظموں میں شامل کیا ہے)

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی ("یاد")

اور — مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم ("تجدید ملاقات")

میں نے پہلی دفعہ "مدینہ" میں ہی پڑھی تھیں۔ ۱۷-۱۸ سال پہلے کی بات کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر غزل مسلسل کے ساتھ ایک ادارتی نوٹ بھی تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ترک شراب اور نکاح ثانی کے بعد یہ جگر صاحب کا پہلا کلام ہے۔

جگر صاحب کے متعلق اتنا کچھ سننے میں آتا کہ کم سے کم اُن کی صورت دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہونا لازمی تھا۔ پھر اُن کے مسحور کُن ترنم کے چرچے تھے۔ بعض احباب اور شناسا جگر صاحب کے ترنم کی نقل بھی کیا کرتے۔ اس لئے اُنھیں "بہ نفس نفیس" سننے کا شوق بھی تھا، اور بعد میں اُن سے ملنے، بات چیت کرنے اور ان کی ہم نشینی کا شرف حاصل کرنے کی آرزو بھی پیدا ہوئی۔ اپنی پسند کی بڑی شخصیتوں سے ملنے کی خواہش میرے نزدیک عین فطری ہے۔ میں نے تو بڑے سے بڑے "بے نیاز" قسم کے لوگوں کو بھی اسی آرزو میں تڑپتے دیکھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کا احساس کمتری ملنے ملانے میں پہل نہیں کرتا بلکہ متوقع رہتا ہے کہ ان سے بڑی شخصیت خود پہلے ان کی طرف متوجہ ہو۔

جگر صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی جب میں کلکتہ میں تھا۔ "آتش گل" کو چھپوانے کا انتظام اے۔ ڈی اظہر صاحب نے کیا تھا جو اُن دنوں چٹاگاؤں میں کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ آپ کو شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ان کی کوششوں سے ایک دفعہ حفیظ جالندھری کو چٹاگاؤں میں پچیس ہزار روپے کی

تفصیلی پیش کی گئی تھی ۔ آپ نے کلکتہ کے مشہور تاجر اور "عصرِ جدید" کے مالک خان بہادر محمد جان کے توسط سے جگر صاحب کو رائلٹی کی رقم دلوانے کا بندوبست کیا تھا۔ جگر صاحب روپے کی وصولی کے سلسلے میں کلکتہ آئے تھے اور اپنے ایک دیرینہ دوست کے یہاں کیننگ اسٹریٹ میں مقیم تھے ۔ رائلٹی کی رقم کا صحیح علم نہیں ۔ کچھ لوگ کہتے تھے ہزار روپے ملے ہیں، کسی نے بارہ سو بتائے ۔ لیکن عام طور پر یہ سننے میں آیا کہ اطہر صاحب نے یہ مجموعہ پاکستان کے لئے دو ہزار میں خریدا ہے ۔ حقیقت جو بھی ہو، البتہ میں نے جگر صاحب کی جیب میں سو سو کے کئی نوٹ اس شانِ بے نیازی سے رکھے ہوئے دیکھے تھے کہ ان کے کسی لمحے بھی جیب سے نکل کر گر پڑنے کا پورا امکان تھا ۔

اتفاق سے اُنھیں دنوں سی ۔ ایم ۔ او ہائی اسکول میں پہلی دفعہ بزم مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا ۔ پرویز شاہدی اسکول کے نئے ہیڈ ماسٹر تھے، اور سالک لکھنوی سکریٹری ۔ میں بھی اس اسکول سے متعلق تھا ۔ یہ اسکول یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کا قائم کردہ ہے جس کے سکریٹری احمد اللہ بزمی انصاری ہیں ۔ جگر صاحب مشاعرے میں "بلامعاوضہ" شرکت کے لئے بلا تکلف تیار ہو گئے ۔ وہاں انھوں نے تین غزلیں سنائیں، جن میں ایک وہ غزل تھی جس کا مشہور شعر ہے :

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

حیدرآباد کے ایک صاحب تھے عبد المجید، جنھوں نے اپنا نام پلٹ کر 'مجید عبدل' رکھ لیا تھا ۔ طبیعت میں مزاح تھا لیکن اکثر وہ پھکڑپن کی حد تک جا پہنچتا تھا ۔ انھوں نے حسبِ عادت مشاعرے میں ہوٹنگ کی کوشش کی، اور انھیں رسوا ہو کر وہاں سے نکلنا پڑا ۔ اس کا انتقام لینے کے لئے انھوں نے مشاعرہ کا ایک طنزیہ خاکہ لکھا جس میں کلکتہ کے چند شاعروں کے علاوہ جگر صاحب کا بھی مذاق اُڑایا گیا ۔ یہ خاکہ ۲۶ اپریل ۵۲ء کے ہفتہ وار "امن" کلکتہ میں "ٹیکنی کلر اور مشاعرہ ہوتا رہا" کے عنوان سے شائع ہوا ۔ شاعروں کے نام بدل دیے گئے تھے "قلب ماہیت" سے پرویز شاہدی کو لبریز شہیدی، اشک امرتسری کو مُشک عنبری، رضا مظہری کو دغا مخبری، احسان دربھنگوی کو اعلان دربدری، ابراہیم ہوش کو جراثیم پوش، سالک لکھنوی کو بالک نمائشی

اور مجھے مسٹر ابہام بنا دیا گیا تھا۔ جگر صاحب کی بابت جو کچھ لکھا گیا، وہ ملاحظہ کیجیے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔

"دگر بزن آبادی مائک پر تلملانے لگے۔ غزل تو پوری قابل داد تھی، لیکن ایک شعر میں موجودہ مشکلات کا حل اس خوش اسلوبی سے پیش کیا کہ (سامعین کے بارے میں تو کہہ نہیں سکتا) خود آپ دنگ رہ گئے۔ شعر میں محبوب کی زلفوں کو کھینچ تان کر جہاں جہاں پہنچایا ہے، اس کی قلمبندی مشکل ہے۔ غرض کپڑے کے ایک اہم مسئلے کو چٹکی میں حل کر کے رکھ دیا اور اس دور میں زلفوں کا ایسا کارآمد استعمال غریبوں کو کپڑے کی احتیاج سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ شعر گیسو دراز ہیر آئل کی تشہیر کا بہترین ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔"

جگر صاحب کلکتے میں دو ہفتوں سے زیادہ ہی ٹھہرے ہوں گے۔ میں کولوٹولہ اسٹریٹ میں رہتا تھا جو کیننگ اسٹریٹ سے متصل ہے۔ جگر صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ جب بھی گیا وہ تاش کھیلنے میں مصروف نظر آئے۔ کوئی ملنے والا آتا تو تاش چھوڑ کر اس کی طرف مخاطب ہو جاتے۔ ان کی گفتگو کا انداز بالکل ویسا ہی تھا، جیسا محمد طفیل اڈیٹر "نقوش" نے اپنے خاکے "جگر صاحب" میں پیش کیا ہے۔ ابھی سیاسیات پر گفتگو ہو رہی ہے کہ اچانک تصوّف اور الٰہیات کی طرف مڑ گئے، پھر عشقیہ شاعری کی طرف، پھر احباب کے بعض کارناموں کی طرف ..... باتیں اکثر اُکھڑی اُکھڑی اور بے ربط ہوتیں، لیکن پھر بھی جی چاہتا کہ انھیں ہی بولنے کا موقع دیا جائے۔ ان کے اندازِ گفتگو میں کچھ اتنی طفلانہ معصومیت ہوتی کہ میں سوچنے لگتا، آخر یہ شخص وارداتِ حُسن و عشق کے گہرے نفسیاتی رموز سے کس طرح واقف ہو سکا۔

کلکتہ میں جگر صاحب کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک دن گھوڑا گاڑی پر سیر کرنے نکلے۔ سوئے اتفاق کہ لاری سے گاڑی کی ٹکر ہو گئی۔ جگر صاحب زخمی ہو گئے۔ میں اور پرویز شاہدی ان کی عیادت کو گئے۔ تھوڑی دیر میں اشک امرتسری اور اقبال اکرامی بھی آ پہنچے۔ مؤخر الذکر آج کل روزنامہ "امروز"، کلکتہ کے اڈیٹر ہیں، اُن دنوں روزنامہ "آزاد ہند" میں "نمک پاش سلمہ" کے نام

سے فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اس ملاقات کی تفصیل ان کی زبانی سنئے، جو ۲۷ اپریل ۵۳ء کے روزانہ "آزاد ہند" کلکتہ میں شائع ہوئی تھی:

"آج کل حضرت جگر مرادآبادی کلکتہ آئے ہوئے ہیں۔ تین دن ہوئے کہ بچارے ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ گھوڑا گاڑی پر "لب دریا کے کنارے کنارے" تفریح فرماتے چلے آ رہے تھے کہ پیچھے سے ایک ظالم لاری نے ٹکر مار دی۔ جگر صاحب شاعر تو بہت بڑے ہیں مگر جسامت کے لحاظ سے واجبی ہیں، لہٰذا گھوڑے گاڑی کو الوداع کہنے پر مجبور ہوئے اور بغیر اپنی خواہش یا مرضی کے نیچے آ گئے۔ اس حادثے کی خبر سن کر جہاں کلکتہ کے دوسرے ادیب آپ کی مزاج پرسی کے لئے گئے، پرویز شاہدی اینڈ کمپنی کے ساتھ خاکسار بھی پہنچا۔ وہاں پہنچکر کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوئی جب تک کہ پرویز صاحب کی پرسشِ مزاج پر جگر صاحب نے اپنا شکم مبارک کھولکر نہیں دکھایا۔ جسم سے قمیص کا ہٹنا تھا کہ ہمیں بڑی کوفت ہوئی۔ ایک نازک مزاج شاعر اُس وقت رُوحانی کرب میں مبتلا تھا۔ مگر واہ رے اخلاق کہ جگر صاحب ہم لوگوں کے ساتھ ہنستے رہے، باتیں کرتے رہے، آپ نے اخلاقاً ایک عدد غزل بھی سنائی۔

جگر صاحب کی دُنیا بدل چکی ہے۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر پہلے "بنتی نہیں تھی بادہ و ساغر کہے بغیر" تو اب گفتگو کے وقت زبان سے تصوّف اور معرفت کے بیان ہوتے ہیں۔ اثنائے گفتگو میں جوش ملیح آبادی صاحب کا ذکر آ گیا تو آپ نے کہا کہ انھیں ملحد سمجھنے والے احمق ہیں۔ جوش پکے مسلمان ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں اصلاح کی غرض سے۔ پرویز صاحب سے کچھ سیاسی رنگ میں بھی گفتگو ہوئی۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جگر صاحب سیاست کے مسئلے بھی تصوّف سے حل

کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کمیونزم کو بھی آپ نے مذہبی نقطہ نظر سے حل کر دیا۔ اور ہمارے دل نے کہا کہ چلو قصہ ختم ہوا۔ ہندستان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر کے اس ارشاد کے بعد کون ہے جو کمیونسٹوں کو لامذہب کہے! دیکھا چاہیے اسلام کے نام نہاد علمبردار جگر صاحب پر کب کفر کا فتویٰ دے کر سنگ باری کی دفعہ لاگو کرتے ہیں؟

مگر ہمیں پریشانی اس وقت ہوئی جب پرویز شاہدی، اشک امرتسری اور مظہر امام جیسے شاعرانِ شیریں کلام کے ہوتے ہوئے جگر صاحب کی نظرِ التفات اس خاکسار پر پڑنے لگی، اور لگے کچھ کلام سنانے کی فرمایش کرنے۔ بھلا ہمارے ایسے غیر مہذب انسان کو کلام سے کیا واسطہ، اور جہاں اس قدر اہل علم حضرات جمع ہوں، وہاں بد کلامی تو ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا ہم نے گھڑی دیکھی اور نماز جمعہ کا عذر کر کے وہاں سے چلتے پھرتے نظر آئے۔ یہ معلوم نہیں کہ ہماری تشریف آوری کے بعد دوسرے شاعروں پر کیا گزری۔ آیا انھوں نے اپنا کلام بلاغت نظام سنایا یا ہماری ہی طرح ہکلاتے ہوئے وہ بھی بھاگے۔''

جگر صاحب ''ہکلانے'' اور ''بھاگنے'' کا موقع بہ آسانی کب دینے والے تھے۔ اپنا بھی کلام سنایا۔ ہم لوگوں سے بھی کلام سُنا اور بڑے خلوص سے داد دیتے رہے۔ جوش صاحب کا ذکر دورانِ گفتگو میں اکثر آیا۔ اُس روز بھی، اس کے بعد بھی۔ جوش صاحب کے ''مسلمان'' ہونے پر تو انھوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی جس کا ذکر آچکا۔ انھوں نے جوش صاحب کے اخلاقی کردار سے بعض ایسے پردے اٹھائے جن کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ اُن کا دُہرانا ہر طرح خلاف تہذیب سمجھا جائے گا۔ رشید احمد صدیقی کا ہی نہیں، جوش ملیح آبادی کا بھی ''دعویٰ'' ہے کہ جو شخص اچھا انسان نہیں، وہ اچھا ادیب یا شاعر نہیں بن سکتا۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کاش ایسا ہی ہوتا۔ لیکن جوش صاحب کی بابت جو باتیں جگر صاحب کی زبانی سننے میں آئیں، اگر وہ درست ہیں (اور کوئی وجہ نہیں کہ غلط ہوں، کیونکہ جگر صاحب کو متفقہ طور پر نیک اور شریف النفس انسان تسلیم کر لیا گیا ہے) تو خود

جوشؔ کا اچھا انسان ہونا مشکوک ہو جاتا ہے اور اسی منطق کی رُو سے ان کا اچھا شاعر ہونا بھی۔ ویسے آج بھی اکثر میرے ذہن میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ تصوّف کے کس مسئلے کی رُو سے جگرؔ صاحب نے جوشؔ کے بارے میں اتنی رکیک باتیں بتائیں۔

جوشؔ صاحب اُس وقت تک پاکستان نہیں گئے تھے۔ جگرؔ صاحب کی گفتگو سے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ اُس وقت دونوں کے تعلقات و مراسم اچھے نہیں تھے حالانکہ جگرؔ صاحب اپنی رندی اور سرمستی کے دَور میں جوشؔ کے بہت قریب رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا بیان ہے کہ انھوں نے جگرؔ کو نشہ کے عالم میں کبھی کوئی غیر مہذّب حرکت کرتے یا ہوش و حواس کھوتے نہیں دیکھا۔ جوشؔ کا بیان اس کے برعکس ہے۔ انھوں نے مجازؔ کو جگرؔ کی وہ کیفیت یاد دلا کر ڈرایا تھا جب وہ مدہوشی کے عالم میں دوسروں کی گردن میں اپنے پاؤں کا ہار ڈالا کرتے تھے۔ مجھے جگرؔ صاحب کی شراب نوشی کا دَور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن ایک دفعہ جوشؔ صاحب کو جام پر جام خالی کرتے دیکھا ہے اور میں نے ان کی سنجیدگی اور توازن میں سرِمُو فرق نہیں پایا۔

شاید میں غیر متعلق باتیں کرنے لگا ہوں، اس بحث کو میرے مضمون کی حدود سے خارج سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیے۔

جگرؔ صاحب کا خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں ایک نہایت ناگوار واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ۵۱ء سے ۵۴ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین کلکتہ (اردو ہندی) ایک بڑی ادبی انجمن تھی جس کی سرگرمیاں ہر طبقۂ خیال کے اہلِ ذوق کو دعوتِ توجہ دیتی تھیں۔ اس دوران اس انجمن میں کئی اہم بیرونی شخصیتوں نے شرکت کی، جن میں سردار گوربخش سنگھ، ممتاز حسین، پرتھوی راج کپور، کرنجیا اڈیٹر بلٹز، سردار جعفری، غلام ربّانی تاباںؔ، نیرج، بھگوت شرن اپادھیائے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جگرؔ صاحب کے اعزاز میں بھی انجمن کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا۔ میں نے ان سے انجمن کے اس جلسہ میں شرکت کی درخواست کی اور وہ ازراہ شفقت رضامند ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ ایسے جلسوں میں جن میں کوئی نمایاں شخصیت آتی، حاضرین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن مائک کے انتظام کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ جگر صاحب آہستہ بولنے کے عادی تھے۔ ان سے گذارش کی گئی کہ وہ اپنے شعری نظریات اور فکری مسلمات پر روشنی ڈالیں۔ حسب معمول وہ انسانیت، تصوّف، اشتراکیت، سب کچھ گفتگو میں سمیٹ لائے۔ ان کی آواز ہال کے آخری سرے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پھر بھی لوگ خاموشی سے انھیں سُن رہے تھے۔ اتنے میں کامریڈ قسم کے ایک صاحب (جن کا نام میں قصداً نہیں لکھ رہا ہوں) جو ایک کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور شاید جگر صاحب کی آواز ان تک نہیں پہنچ رہی تھی، جگر صاحب کو مخاطب کر کے بڑی بدتمیزی سے بولے "چھوڑیئے چھوڑیئے یہ باتیں۔ کوئی غزل سنایئے۔" ممکن ہے کامریڈ موصوف ایسی باتیں برداشت نہ کر سکے ہوں جو "کٹر ترقی پسندی" سے سو فیصدی اتفاق نہ رکھتی تھیں (میں اُنھیں طنزاً "کامریڈ" نہیں کہہ رہا ہوں۔ سچ مچ وہ "کامریڈ فلاں" پکارے جاتے تھے) موصوف کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر معاملے میں اختلاف کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اگر ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی برسر اقتدار آگئی تو وہ اپوزیشن میں شامل ہو جائیں گے۔

چند لمحوں تک ہم لوگ حیرت سے ان کا منہ تکتے رہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، لیکن جب انھوں نے اپنی بات دُہرائی اور جگر صاحب نے بھی سن لی تو پھر ہم لوگ جس ندامت اور شرمندگی سے دوچار ہوئے، اس کا تصور کر کے میری پیشانی پر اب بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت میری پریشانی اور بے موقعگی کا احساس کیجیے جبکہ میں ہی اصرار کر کے انھیں محفل میں لایا تھا۔ پرویز صاحب تو یوں بھی ذرا جلد پریشان ہو جاتے تھے، ان کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہم سب نے جگر صاحب سے معذرت کر کے اس ناگوار واقعے کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا صرف معذرت خواہی کسی غیر مہذب فعل کا لگایا ہوا زخم تو نہیں دھو سکتی۔ ہم لوگوں نے جگر صاحب سے گذارش کی کہ وہ اپنا کچھ کلام سنائیں۔ وہ راضی نہ ہوئے — صرف اتنا کہا "مجھے کوئی رنج نہیں۔ بس

ایک تکدر پیدا ہوگیا ہے۔ اب اسے رہنے دیجئے۔"

میں نے جن کامریڈ کا ذکر کیا، وہ اُس وقت انجمن مذکور کے ممبر نہیں تھے۔ بعد میں جب انھوں نے ممبر بننے کی خواہش کی تو ہم میں سے اکثر ممبران ان کو یہ درجہ دینے پر رضامند نہ ہوئے۔ پرویز شاہدی، سالک لکھنوی وغیرہ انھیں انجمن میں جگہ دینے کے روادار نہ تھے۔ خود میں نے شدید مخالفت کی تھی اور انجمن ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ جو شخص تہذیب کی مبادیات سے واقف نہ ہو، جو ہمارے ادب کی اتنی عظیم اور بزرگ ہستی کو اس طرح ذلیل کرنے کی جرأت کر سکتا ہو، اسے انجمن کا ممبر بنانا انجمن کی توہین ہے۔ البتہ کچھ دوسرے ممبروں نے آپس کے ذاتی اختلافات کے مقابلے میں انجمن کی بلند تر قدروں کو نظرانداز کیا اور کامریڈ موصوف کو انجمن میں شامل کرنے کی تائید کی۔ اُس وقت انجمن کے سکریٹری مظہر انصاری تھے جن کے خلوص، سادہ مزاجی اور نیک نفسی پر اُن کے دشمن بھی شبہ نہیں کر سکتے۔ وہ ہر چند کہ اس خاص جلسے میں شریک نہ تھے، لیکن جب انھیں اس واقعے کا علم ہوا تو نہایت دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہوئے اور کامریڈ موصوف کو ممبر بنایا گیا تو آپ نے انجمن سے استعفا دے دیا۔ جگر صاحب نے انجمن میں تصویر کا ایک رُخ دیکھا تھا۔ کاش انھوں نے یہ روشن اور تابناک رُخ بھی دیکھا ہوتا!

جگر مرادآبادی ہم میں نہیں رہے۔ وہ ہمارے لئے اپنے کلام کی دولت چھوڑ گئے ہیں یا پھر چند یادوں کا سرمایہ۔ جگر صاحب کی شاعرانہ حیثیت کو مختلف ناقدوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابھی ان کی موت کا غم اتنا تازہ ہے کہ شاید ہم لوگ جذبات کے دائرے سے بہ آسانی باہر نہ نکل سکیں۔ یوں بھی کسی شاعر کے مرتبہ کا تعین کرتے وقت سبھی ایک رائے نہیں ہو سکتے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کس پایہ کے شاعر ہیں، اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو کہ انھوں نے ہماری غزل کو مہذب اور فطری عشق سے آشنا کیا ہے۔ وہ ہمارے دَور کے محبوب ترین شاعر تھے اور ان کی محبوبیت ان کے کلام یا ان کے ترنم میں ہی نہیں، ان کی شخصیت میں بھی پنہاں ہے۔

● ۱۹۶۰ء

ملیح آبادی

مولانا ملیح آبادی کو ذاتی طور سے جاننے کا مجھے اتنا موقع نہ ملا کہ میں ان کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات تفصیل کے ساتھ پیش کر سکوں۔ جن دنوں میں میٹرک کا طالب علم تھا، کبھی کبھی "روزانہ ہند" دیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ یہ اُن دنوں اہم قوم پرست اخباروں میں شامل تھا۔ اس کے بانی اور ایڈیٹر ملیح آبادی تھے۔ ان کے اداریوں سے ان کے صحافیانہ وقار کا رُعب مجھ پر پڑ چکا تھا اور اس رعب کا اثر زائل کرنے کے لیے میں اکثر اپنے آپ سے پوچھا رہتا تھا۔ "واہ، یہ کیا، صرف ملیح آبادی؟"

ملیح آباد سے اس وقت میری واقفیت صرف دو ہی وجہوں سے تھی — ایک تو سفیدے آم کے باعث، دوسرے جوش کے سبب سے۔ اس وقت تک وہاں کے آموں کا مزہ چکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پھر خود میرا علاقہ آموں کے لیے دُور دُور تک شہرت رکھتا ہے۔ جب سے میں نے پریم چند کے افسانے میں دربھنگا کے آموں کا تذکرہ پڑھا تھا، میری نظر سے دیگر علاقوں کے آموں کی وقعت گر گئی تھی۔ پریم چند بنارس میں رہ کر اپنے قریب کے ملیح آباد یا لکھنؤ کے آموں کا نہیں بلکہ دربھنگا کے آموں کا ذکر کریں تو ایک لڑکے کے ذہن میں جس کی زندگی

تمام تر اسی چھوٹے سے شہر میں گزری ہو، اس طرح کی عصبیت کا پیدا ہونا کچھ غیر فطری بھی نہیں۔ آموں کے معاملے میں ملیح آباد کو دربھنگے کا حریف بنتے دیکھنا مجھے کب منظور ہوتا۔ وہ تو ملیح آباد کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں جوشؔ پیدا ہوئے، جن کا کلام مجھے اس زمانے میں اُردو کے تمام شاعروں سے زیادہ پسند تھا۔ اقبالؔ سے بھی زیادہ۔ غالبؔ سے اُس وقت تک خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی اور میرؔ بس ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتے تھے۔ یہ میری اسکول کی طالب علمی کے آخری دنوں کا ذکر ہے، جب میری عمر پورے چودہ سال بھی نہیں ہوئی تھی۔

"روزانہ ہند" میں ملیح آبادی کی کتابوں کے اشتہارات اکثر دیکھتا رہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کس تعصب کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ سے چھپی ہوئی کتاب پڑھنے کی طرف رغبت نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہاں کی جو مطبوعات میری نظر سے گزری تھیں وہ عموماً اخباری کاغذ پر چھپی ہوئی اور کتابت و طباعت کی خوش سلیقگی اور نفاست سے محروم تھیں۔ یوں بھی مولانا کی بیشتر کتابیں مذہبی فلسفے یا تاریخ سے متعلق تھیں، جن سے اُن دنوں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا بچپن کٹر مذہبی ماحول میں گزرا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا، والد کو پوری طرح صوم و صلوٰۃ کا پابند اور قرآن و حدیث کا باقاعدہ مطالعہ کرتے دیکھا۔ اُن کے پاس مختلف احادیث اور مذہبی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جو ہمیں ورثے میں ملا۔ میں ابھی بچپن کی سرحد عبور نہیں کر پایا تھا کہ والد چند ماہ کی علالت کے بعد بغیر کچھ کہے سُنے ہم سے رُخصت ہو گئے۔ ایک غیر متوقع اور اچانک عدم موجودگی نے میرے ناپختہ ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ مایوسی، دل شکستگی اور عدم تحفظ کے احساس نے ایک عرصے کے لیے مذہب سے بے تعلقی اور خدا سے ایک نوع کی بیزاری پیدا کر دی۔ مختصر یہ کہ اپنے والد کے چھوڑے ہوئے ورثے کو بڑے احترام سے محفوظ رکھنے کے باوجود میں ان کے مطالعے کی جانب اپنے آپ کو راغب نہ کر سکا۔ پھر مولانا ملیح آبادی کی مذہبی کتابوں کو بطور خاص حاصل کر کے پڑھنے کی سعادت کس طرح نصیب ہوتی!

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں خالی خالی سا تھا کہ اپنے ایک ہم وطن (بلکہ "ہم محلہ") عطاء الرحمٰن سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہو گئی جو اپنے والد جناب ذاکر حسین ذاکر کے ساتھ

کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب اُس وقت کی مشہور" ہندوستان گراموفون ریکارڈ کمپنی" سے وابستہ تھے اور اس کمپنی کے علاوہ نیو تھیٹرز اور دوسرے فلم ساز اداروں کے لیے گانے لکھا کرتے تھے۔ عطار الرحمٰن اپنے ساتھ کلکتہ سے کچھ کتابیں بھی لائے تھے۔ یہی میری اور ان کی دوستی کی بنیاد بنیں۔ انہیں کتابوں میں ملیح آبادی کے ترجمے کیے ہوئے افسانوں کا مجموعہ " ترکی افسانے" بھی تھا میں نے اسے بڑے چاؤ اور اشتیاق سے پڑھا۔ اس کے بعد سے ملیح آبادی کی تحریروں اور ان کی شخصیت میں دل چسپی بڑھی۔ کلکتہ کا کوئی واقف کار ملتا تو اس سے ملیح آبادی کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ ان کی بذلہ سنجی اور کتّے پالنے کے شوق سے لے کر اُن کے آتش بارادار یوں، ان کی بے باکی اور بے خوفی، اُن کے قتل کی سازش، ان کے اشتراکی رجحانات وغیرہ کی بابت اُنہیں ذرائع سے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ایسے شخص سے ملنے اور اس سے اکتساب فیض کرنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ لیکن افسوس کہ جب ۱۹۵۱ء کے اواخر میں میرے لیے کلکتہ میں مستقل قیام کی صورت نکلی تو ملیح آبادی دہلی میں تھے۔ البتہ ان کا ذکر کلکتے کے ہوٹلوں، اخباروں کے دفتروں اور دوستوں کی محفلوں میں برابر ہوتا رہتا تھا۔

ملیح آبادی سے مجھے پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت وہ کینسر کا شکار ہو چکے تھے اور بمبئی میں علاج کے بعد بہ ظاہر شفایاب ہو کر لوٹے تھے۔ پرویز شاہدی ان کی مزاج پرسی کے لیے دفتر " آزاد ہند" گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ ملیح آبادی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ حلق کے اوپری حصّے پر ریڈیم سے جلائے جانے کا نشان تھا جو کینسر کے علاج کا پتہ دیتا تھا۔ میں نے پہلے اُنہیں دیکھا نہیں تھا، اس لیے قبل کی صحت سے ان کی موجودہ صحت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے وہ اچھے خاصے تندرست معلوم ہوتے تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے، لیکن وہ چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہ معلوم ہوتے تھے۔ سننے میں آیا کہ وہ اپنی عمر ستر اسّی سے کم نہیں بتلاتے۔ مولانا ملیح آبادی سے میرا تعارف ضرور ہوا لیکن مجھ سے ان کی کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی۔ پرویز صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں جن میں سے صرف ایک بات یاد رہ گئی ہے۔ پرویز شاہدی نے اُن سے

شاید منصور کی بابت اپنی واقفیت کی تائید چاہی تھی کہ وہ مسلمان نہیں بلکہ مجوسی تھا اور مولانا ملیح آبادی نے جواب اثبات میں دیا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے ساتھ ہی مولانا کے بارے میں اتنی ساری باتیں سُن چکا تھا کہ انہیں "روایتی مولانا" نہ پاکر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ عام طور پر مولاناؤں کے متعلق میرا تصوّر یہ ہے کہ وہ بلند قامت اور لحیم شحیم ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی نے مجھے نصف مایوس کیا تھا کیونکہ وہ بلند قامت نہ تھے۔ البتہ لحیم شحیم تھے۔ مولانا ملیح آبادی دونوں اعتبار سے مایوس کُن ثابت ہوئے اور اُس وقت مجھے پتہ چلا کہ وہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بجائے صرف و محض "ملیح آبادی" کیوں ہیں! شاید ان کے قدوقامت کے لحاظ سے اتنے بڑے نام کا جامہ انہیں زیب نہ دیتا تھا۔

مولانا موصوف سے دوسری اور آخری دفعہ ۵۸ء میں ملنے کا موقع ملا۔ آپ مولانا آزاد کی وفات کے بعد دل شکستہ اور دلّی سے دل برداشتہ ہو کر کلکتہ واپس آگئے تھے اور اپنے صاحب زادے احمد سعید ملیح آبادی مدیر "آزاد ہند" کے ساتھ مقیم تھے۔ میں سید میر محمود طرزی صاحب سے ملنے ان کے پریس گیا تو مولانا ملیح آبادی وہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا، ان کی خیریت دریافت کی اور ان کے دہلی چھوڑ دینے کے بابت ان سے گفتگو کرتا رہا۔ مولانا ہر بات کا جواب بڑی محبت، نرمی اور سنجیدگی لیکن اختصار کے ساتھ دیتے رہے۔ طرزی صاحب نے مولانا سے مخاطب ہو کر حسب معمول مبالغے کے ساتھ میری تعریف کی تو مولانا نے فرمایا:

"میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کا کلام گذشتہ دنوں کُل ہند مشاعرے میں سُن چکا ہوں۔ آپ کی تحریریں رسالوں میں بھی پڑھی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ بہت طباع ہیں۔ اب تو آپ نوجوانوں سے ہی مستقبل کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔"

یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا نے واقعی میری تحریریں پڑھی تھیں یا محض میرا دل رکھنے کو کہہ دیا تھا۔ میں نے مولانا کی خدمت میں اپنی شادی سے متعلق لکھی ہوئی تہنیتی نظموں کا مجموعہ "شاخ حنا" پیش کیا۔ جو انہیں دنوں تاج پریس کلکتہ کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔ مولانا نے بڑے اخلاق اور انکسار کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ کتابچے کو اُلٹ پلٹ کر سرسری طور سے کچھ چیزیں دیکھیں اور فرمایا۔ "آپ کا یہ تحفہ بہت گراں قدر ہے۔ میں اسے اطمینان سے پڑھ کر اپنی رائے دوں گا۔" جہاں تک مجھے علم ہے

مولانا کو شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ اپنے رسالے ماہ نامہ "سوغات" دہلی میں جمیل مظہری کی طویل نظم "فریاد" شائع کرتے ہوئے مولانا ملیح آبادی نے اپنی طرف سے جو نوٹ دیا تھا، اس میں بھی اس امر کا اعتراف موجود ہے۔ علی جواد زیدی کا بیان ہے کہ مولانا اردو اور فارسی کے اشعار کو موزوں بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لیکن مولانا نے جس انداز سے "شاخِ حنا" کی پذیرائی کی اور جن الفاظ میں انہوں نے میری تحریروں کو سراہا، اس سے ان کی بڑائی کے نقوش میرے لوحِ دل پر مرتسم ہو گئے۔ ان دونوں ملاقاتوں میں مولانا ملیح آبادی نے اپنی کسی حرکت یا اندازِ گفتگو سے اپنی برتری اور عالمانہ شان کا سکہ بٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں ان کی اس ادا سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ مجھے کب معلوم تھا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہوگی۔ کچھ ہی دنوں بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ کو خیر باد کہہ کر کٹک آنا پڑا۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اردو کانفرنس اور ہند و پاک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا تو ملیح آبادی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اپنے مکان کے زینے سے اترتے ہوئے پھسل کر گر پڑے۔ کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور اب وہ صاحبِ فراش ہیں۔ کٹک واپس آیا تو اطلاع ملی کہ کینسر کے علاج کے لیے انہیں پھر بمبئی لے جایا گیا ہے۔ وہیں سے ۲۴ جون ۱۹۵۹ء کو ان کے انتقال کی خبر بھی آئی۔ ایک اعلیٰ صفات ہستی کی موت سے زیادہ اپنی خود غرضی کی بنا پر مجھے اس بات کا غم رہا کہ انہیں مزید قریب سے دیکھنے، ان سے استفادہ کرنے اور ان کی شخصیت کی رنگارنگی کو جذب کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کاش مولانا اس قدر جلد ہم سے رخصت نہ ہوتے اور مجھے اچانک کلکتہ نہ چھوڑنا پڑتا۔

مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی تعداد درجنوں تک پہنچتی ہے۔ انہوں نے امام ابن تیمہ کی بعض اہم کتابوں کو بھی عام فہم اور دل پذیر انداز میں اردو میں منتقل کر کے عوام اور خواص دونوں میں مقبول بنایا۔ مولانا ملیح آبادی کو عربی زبان پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ اور ان کی عربی دانی پر خود اہلِ عرب رشک کرتے تھے۔ شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے عربی پندرہ روزہ جریدہ "الجامعہ" نے ارضِ بیت اللہ

کو انگریزوں سے آزاد کرانے اور شاہ سعود عبدالعزیز کی حکومت قائم کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔
پھر مولانا آزاد کے ایماء پر ملیح آبادی نے عربی جریدہ "ثقافت الہند" کی زمام ادارت سنبھالی یہ
رسالہ اب بھی انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند کے زیرِ اہتمام چھپتا ہے۔
ان دونوں رسائل نے عرب ممالک میں بڑی ہردلعزیزی حاصل کی اور ایک بلند پایہ صحافی کی حیثیت
سے مولانا ملیح آبادی کو ہندوستان سے باہر بھی سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔
۱۹۱۸ء میں عبدالرزاق ملیح آبادی قاہرہ سے تحصیل علم کے بعد ہندوستان واپس آئے۔
جنوری ۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی سے مولانا آزاد کی رہائی ہوئی۔ ان ہی دنوں ملیح آبادی کو مولانا
آزاد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا آزاد کی جوہر شناس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ مولانا عبدالرزاق
ملیح آبادی قدیم و جدید علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عربی زبان پر قدرت اور قلم میں صلابت ہے۔
۱۹۲۰ء میں جب مولانا آزاد نے جامع مسجد ناخدا میں مدرسہ اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی تو انہوں نے
ملیح آبادی کو کلکتہ بلالیا اور موخرالذکر ہی کی محنت اور کوشش سے مدرسہ پروان چڑھا۔ پھر جب مولانا
آزاد نے کلکتہ سے ہی ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہفتہ وار "پیغام" کا اجرا کیا تو اس کی ادارت و اشاعت کی
ذمہ داری عبدالرزاق ملیح آبادی کو سونپ دی۔ اس وقت سے مولانا آزاد کا تعلق ملیح آبادی سے تاعمر
قائم رہا۔ آزادی کے بعد جب مولانا آزاد حکومتِ ہند میں وزیر تعلیم ہوئے تو انہوں نے ملیح آبادی کو
دہلی بلالیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ مولانا آزاد سے عمر بھر کی رفاقت اور علمی زندگی میں اُن سے کافی
حد تک اثر پذیر ہونے کے باوجود ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی طرزِ انشاء سے کوئی اثر قبول
نہیں کیا۔ ملیح آبادی کی نثر مجھے حالی اور غالب کی سادہ، سلیس اور رواں نثر سے قریب نظر
آتی ہے۔ مولانا آزاد کی نثر نے ہر چند اُردو کے بعض ادیبوں پر گہرا اثر ڈالا اور ان کے اسلوبِ
تحریر کو پڑھے لکھے طبقے میں اچھی خاصی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد
کا اندازِ نگارش اُردو زبان کے حق میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس اسلوب نے بالواسطہ
روزمرہ اور بول چال کی زبان سے اُردو نثر کو دُور رکھنے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے اردو زبان

کی عوامی مقبولیت پر دُور رس منفی اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا آزاد کا اسلوب منفرد اور سحر انگیز سہی، لیکن اس کا حلقۂ اثر محدود ہے۔ مولانا آزاد کی نثر کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق اور محمد حسن عسکری نے بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ملیح آبادی کی نثر نے اردو زبان کی زیادہ خدمت کی ہے۔ ان کی نثر میں نہ تو شاعرانہ آرائش ہے اور نہ الفاظ کا طمطراق۔ ظاہری شان و شوکت سے پُر، مرصّع اور مسجّع عبارت ان کے یہاں شاذ ہی ملے گی۔ وہ اپنے خیالات و محسوسات کو سادگی کے ساتھ اس طرح بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، جس سے ان کے استدلال کا زور واضح بھی ہو اور اثر آفریں بھی۔ خود ملیح آبادی کا بیان ہے:

> "زبان کا کمال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ سادہ اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے تھوڑے سے الفاظ میں بہت سے مضمون کو سموئے ہوئے ہو۔ اس نقطۂ نظر کو میں نے اُردو کے بارے میں بڑی محنت اور کاوش سے حاصل کیا ہے۔"

اسی محنت اور کاوش کے باعث مولانا ملیح آبادی صحافت کے میدان میں اس قدر کام یاب رہے۔ ملیح آبادی کی زبان غالب اور حالی کی نثر کی روایت کی امین ہے۔ یا پھر اس کا مقابلہ ملیح آبادی کے معاصرین مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر عبدالحق کی نثر سے کیا جا سکتا ہے۔ ویسے کبھی کبھی اس کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ ان کی زبان بے رنگ اور بے کیف ہو گئی ہے۔ اُن کے آخری دَور کی تحریروں میں مجھے یہ عیب نظر آیا، جو ممکن ہے عمر کے تقاضے سے ہو یا پھر بسیار نویسی کے باعث "ذکرِ آزاد" میں ملیح آبادی نے مولانا آزاد کی زندگی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ بریلی میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا اور مولانا آزاد کو اس کی صدارت کرنی تھی۔ بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کے معتقدین کا زور تھا جو انگریزی حکومت کے حامی و طرف دار تھے۔ مولانا آزاد بریلی پہنچے تو اُنہیں بتایا گیا کہ اس جلسے میں ان کی شرکت مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ مولانا آزاد اس طرح کی باتوں سے کب خوف کھاتے۔ جلسے میں پہنچے اور مسندِ صدارت پر بیٹھ گئے۔ وہاں اکثریت رضا خانیوں کی تھی اور بہتوں کے ہاتھوں میں بقول ملیح آبادی "ننگے قصابی چھُرے

چمک رہے تھے"۔ اُس جماعت کے ترجمان مولانا سلیمان اشرف تھے جو بڑے وجیہہ انسان اور اعلیٰ پائے کے خطیب تھے۔ مولانا سلیمان اشرف کی تقریر کے دوران مولانا آزاد جوابی حملے کے لئے بیتاب رہے اور جب بولنے کھڑے ہوئے تو بہ الفاظ ملیح آبادی:

"سمندر میں طوفان پر طوفان آنا شروع ہو گئے۔ آتش فشاں پھٹنے لگے۔ زلزلوں نے زمین کو اُلٹ پلٹ ڈالا، ستارے ششدر رہ گئے۔ چاند بھی انسانی طلاقتِ لسانی پر مبہوت ہو کر رہ گیا۔"

مولانا ملیح آبادی کے یہ جملے اُن کے عام رنگ تحریر سے میل نہیں کھاتے۔ ہر چند کہ ان میں سمندر، طوفان، آتش فشاں، زلزلہ جیسے پُرشکوہ اور ستارے، چاند جیسے رومان پرور الفاظ کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ جملے اس جذباتی شدت کی باز آفرینی سے قاصر ہیں جو ملیح آبادی قارئین تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

"ذکرِ آزاد" میں "الہلال" کے دورِ ثانی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ اس میں "انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے جتنے مضامین شائع ہوئے وہ ان کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ مضامین کے ساتھ مصنّف کا نام درج نہیں تھا اس لیے لوگوں نے انہیں مولانا آزاد سے منسوب کر کے، ان مضامین کا مجموعہ ان کے نام سے شائع کر دیا۔ احمد سعید ملیح آبادی کے بیان کے مطابق مولانا ملیح آبادی کے نام سے مطبوعہ کتاب "شہید کربلا" کو بھی مولانا آزاد ہی کی حیات میں عنوان بدل کر ان کے نام سے چھاپا گیا۔ یہ کتاب "شہید اعظم" کے نام سے بازار میں دستیاب ہے۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض اور مضامین کی بابت بھی اس طرح کے دعوے کچھ دوسرے گوشوں سے ہوئے ہیں۔ "انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے جو مضامین چھپے ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طرزِ نگارش مولانا کے اسلوب سے مختلف ہے۔ ان میں مولانا آزاد کے رنگِ انشاء کی جھلکیاں نہیں ملتیں۔ ان مضامین میں تاریخی حقائق بہت ہی سادگی سے افسانوی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ مولانا ملیح آبادی کا عمومی رنگِ تحریر یہی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"دورانِ علالت میں قریش کی ایک جماعت عیادت کو آئی۔ امیر معاویہ نے حاضرین کے سامنے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچا:

"دنیا، آہ دنیا، بس اس کے سوا کچھ نہیں، جسے ہم اچھی طرح دیکھ چکے ہیں
اور جس کا خوب خوب تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اپنی جوانی کے
عالم میں دنیا کی بہار کی طرف دوڑے، اور اس کے سب مزے پوری طرح لوٹے۔
مگر ہم نے دیکھ لیا کہ دنیا نے جلد پلٹا کھایا اور بالکل کایا پلٹ کر دی۔ ایک ایک
کر کے تمام گرہیں کھول ڈالیں۔ پھر کیا ہوا؟ دنیا نے ہم سے بے وفائی کی ہماری
جوانی چھین لی۔ ہمیں بوڑھا بنا دیا۔ آہ! یہ دنیا کتنی خراب جگہ ہے، یہ دنیا کیسا
خراب مقام ہے!

اے لوگو! میں اس کھیتی کی بال ہوں جو کٹ چکی ہے۔ مجھے تم پر حکومت
ملی تھی۔ میرے بعد جتنے حاکم آئیں گے، مجھ سے بُرے ہوں گے۔ ٹھیک اسی طرح
جس طرح اگلے حاکم مجھ سے اچھے تھے!"

کیا یہ مولانا آزاد کی تحریر ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ تعجب ہے کہ جب مولانا آزاد کے نام سے یہ کتابیں اُن کی زندگی میں شائع ہوئیں تو اُنہوں نے ان کی تصنیف سے انکار کیوں نہیں کیا۔ "مقالات الہلال" اور "مضامین البلاغ" بھی ان کی زندگی میں ہی کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کیوں نہ کر دی کہ فلاں فلاں مضامین اُن کے نہیں ہیں۔ اگر "انسانیت مَوت کے دروازے پر"، "شہید اعظم" اور "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض مضامین، جو مولانا کے نام سے منسوب ہیں، ان کے نہیں ہیں تو یہ امر حیرت ہی نہیں، افسوس کا بھی ہے کہ اُنہوں نے اس کی تردید نہیں کی اور غلط فہمی کو پھیلنے کا موقع دیا۔ اب اسے ان کی انا پر محمول کیا جائے، یا ان کی شانِ استغنا یا وضع خاص پر کہ وہ خود سے متعلق کسی مسئلے کی تردید کرنا یا اس کے بارے میں بیان دینا ناپسند کرتے تھے۔ یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد دوسرے کے کام کا کریڈٹ بھی خود لینا چاہتے تھے، لیکن یہ بات اس لئے درست نہیں معلوم ہوتی کہ بحیثیت ادیب مولانا آزاد کی بڑائی "تذکرہ" "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" سے ہے، نہ کہ "انسانیت مَوت کے دروازے پر" اور "شہید اعظم" سے۔

مولانا آزاد کی وفات کے فوراً بعد ملیح آبادی کی تالیف "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی"

شائع ہوئی۔ اس کتاب کی بابت مختلف طرح کی رائیں سننے میں آئیں۔ کچھ لوگوں نے اس شک وشبہ کا اظہار کیا کہ یہ کتاب من گھڑت ہے اور ملیح آبادی نے جلب زر کے لیے مولانا آزاد سے منسوب کردی ہے۔ اس شک کے دو خاص اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ یہ سوانح عمری سینتیس سال کے بعد مولانا آزاد کے وفات پاتے ہی منظر عام پر آئی۔ دوسرے یہ کہ اس میں مولانا آزاد کے مذہبی عقائد کی بابت کچھ ایسی باتیں ہیں جو ایک عالم دین کے شایانِ شان نہیں معلوم ہوتیں اور ان سے امام الہند کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ اس طرح کے شبہ کا اظہار مولانا حفظ الرحمٰن نے بھی بالواسطہ کیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر مجھ پر جو تاثر قائم ہوا وہ یہ تھا کہ یہ زبان مولانا آزاد کی نہیں ہو سکتی۔ اس نوع کی سادہ اور سلیس زبان تو ملیح آبادی ہی لکھ سکتے ہیں، لیکن زبان کی بابت مولانا ملیح آبادی نے کتاب کی ابتدا میں وضاحت کردی ہے کہ یہ سوانح مولانا آزاد کی لکھوائی ہوئی ہے اور تحریر ملیح آبادی کی ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزاد اور ملیح آبادی علی پور جیل میں قید تھے تو اوّل الذکر موخر الذکر کو اپنی زندگی کے حالات بتاتے جاتے جنہیں ملیح آبادی ہر رات قلم بند کر لیتے۔ یوں بھی مولانا آزاد عام بول چال میں ایسی آراستہ زبان نہ استعمال کرتے تھے جو ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کی زندگی ہی میں اس کتاب کے شائع نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعد کے حالات بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہوں، جس کی سبیل پیدا نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملیح آبادی اس مسودے کو ترتیب دے کر شائع نہ کرتے تو مولانا آزاد کی زندگی کے بہت سے واقعات منظر عام پر نہ آسکتے، اور اس طرح ایک بڑی شخصیت کی زندگی کے بعض اہم گوشے ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے۔

جہاں تک مذہبی عقائد کا سوال ہے، یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مولانا آزاد الحاد وانکار کے دَور سے گذرے ہیں۔ اس کا اندازہ "تذکرہ" کے ان صفحات سے بھی ہو جاتا ہے، جن میں مولانا آزاد نے اپنی ابتدائی زندگی کے احوال بیان کیے ہیں۔ ہر چند یہ تحریر غیر معمولی طور پر استعاروں اور کنایوں کے پردے میں ہے، لیکن مولانا کی بعض ذاتی کمزوریوں

سے پردہ اُٹھاتی ہے ۔ یہ اعتراف مولانا آزاد کا مقصد تھا ۔ مجھے ذاتی طور پر ملیح آبادی کی کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نظر نہ آیا، جس سے آزاد کے کردار کی کوئی لغزش ظاہر ہوتی ہو۔

ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے عصرِ جدید بک ایجنسی کلکتہ سے ۱۹۲۳ء میں شائع شدہ شائق احمد عثمانی کی کتاب "امام الاحرار مولانا ابوالکلام آزاد" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

"مولانا آزاد پر سب سے پہلی کتاب اس کے ابتدائی صفحات "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے خلاصے پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء تک کے حالات ہیں۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی مسائل کی نسبت وہ مکمل تحریر بھی ہے، جو اُنھوں نے ۱۹۲۲ء میں علی پور جیل میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو ان کے سوالات کے جواب میں لکھ دی تھی۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ "ذکرِ آزاد" میں مولانا کی تحریر ناقص ہے۔"

اس تحریر سے کم از کم یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں شائع شدہ کتاب میں بھی کم و بیش وہی باتیں ہیں جو "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ "آزاد کی کہانی" ملیح آبادی کی زبانی "خود آزاد کی زبانی نہیں، پھر بھی کتاب کی اہمیت گھٹتی نہیں ہے۔ کیوں کہ کتاب میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں اُن کی صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر مولانا ملیح آبادی کے بیانات پر شبہ کیا جاسکتا ہے، جنھیں مولانا آزاد سے ۳۸ سال کی رفاقت کا شرف حاصل تھا تو پھر دوسرا کون سا شخص ہے جس پر مولانا آزاد کے باب میں اعتماد کیا جاسکے۔

مولانا ملیح آبادی کی صداقت پرستی اور دیانت داری کی گواہی خود مولانا آزاد بہت پہلے دے چکے ہیں۔ مولانا آزاد نے مولانا ملیح آبادی کی گرفتاری پر اپنے ہفتہ وار اخبار "پیغام" کی اشاعت ۲ دسمبر ۲۱ء میں ایک نوٹ لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :

"کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسبِ معمول مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی تو اُن کی جگہ اُن کی گرفتاری

کی خبر نے میرا استقبال کیا۔ وہ اسٹیشن پر ملتے تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی جو گزشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے۔ اِس طرح انہوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزّت کے لئے بھی میرے دل سے تقاضہ کیا۔ اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی عزّت بھی کرتا ہوں!"

اسی نوٹ میں آگے چل کر مولانا آزاد کا ارشاد ہے:

"دو سال ہوئے جب یہ (ملیح آبادی) مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیتِ علم و عمل نمایاں پائی۔ یہ ملک کے اُن مخصوص اہلِ علم نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے خدمتِ خلق و دعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتۂ رفاقت و اخوت جوڑا تھا وہ روز بروز قوی تر ہوتا گیا اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح ان کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی۔"

جب مولانا آزاد ہی مولانا ملیح آبادی کی صداقت پسندی اور حق گوئی کی شہادت دے چکے ہیں تو پھر مجھے یا آپ کو اس میں شک کرنے کا کیا حق ہے؟ یہ دو رفیقوں کا معاملہ ہے۔ میں تو مولانا آزاد کے بیان کی روشنی میں اپنے محترم دوست مظہر انصاری کے اس شعر کی ہم نوائی کرتا ہوں:

مِری آنکھوں نے کیا کھویا ترے جلووں نے کیا پایا
حسابِ دوستاں دل ہی میں رہ جائے تو اچھا ہے!

● ۱۹۶۰ء

اشک امرتسری

مجھے ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۱ئہ کی تاریخ آج بھی یاد ہے!
کُل ہند امن کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلہ میں سردار جعفری کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں مُسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک مشاعرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کلکتہ میں میرے ورود کو ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور میں یہاں کے ادبی ماحول سے قریباً نا آشنا تھا۔ کلکتہ کے ادبی حلقے میں انور عظیم، ش مظفر پُوری اور نشاط الایمان کے علاوہ شاید کسی اور سے میری جان پہچان بھی نہ تھی — پرویز شاہدی سے بھی نہیں! بہر حال کسی کرم فرما کی عنایت سے میرے نام بھی مشاعرے کا دعوت نامہ آگیا تھا۔ کلکتہ کی کسی محفلِ مشاعرہ میں یہ میری پہلی شرکت تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو شعر خوانی کا دَور شروع ہو چکا تھا۔ انور عظیم شعرائے کے نام پکار رہے تھے۔ سردار جعفری اور پرویز شاہدی کے قریب مسندِ صدارت پر ایک دُبلا پتلا شخص موٹے شیشے کی عینک لگائے معمولی قمیص پائجامے میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اندر کو دھنسے ہوئے رخسار، حد سے بڑھی ہوئی لمبی ناک، چہرے پر چیچک کے گہرے داغ، مہندی سے رنگے ہوئے بال، عُمر یہ پچاس کے لگ بھگ۔ بھلا ایسے صدر سے کون متاثر ہوتا!

معلوم ہوا، آپ اشک امرتسری ہیں۔

"کون اشک امرتسری؟"

یہ نام میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ جب اُنھوں نے اپنی نظمیں سنائیں تو ان کا لب و لہجہ بھی اجنبی معلوم ہوا ——— اوروں کے لب و لہجہ سے الگ۔ اور تو یاد نہیں لیکن ان نظموں میں اُن کی ایک مشہور نظم "رکشا والا" بھی تھی جس کی "ٹن ٹن" ۲۰ اکتوبر سنہ ۵۱ء سے اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

اُس دن کا ایک واقعہ میرے ذہن کے پردے پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ مشاعرے میں عموماً فرقِ مراتب کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور صاحب صدر کے بعد ہزل گو شعراء کے علاوہ بڑے سے بڑے شاعر کو بھی کلام سُنانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ معلوم نہیں انور عظیم نے کس "جذبہ سعادت مندی" کے تحت سردار جعفری کے نام کا اعلان اُس وقت کیا جب جناب صدر اپنا کلام سنا چکے تھے۔ سردار جعفری نے مائک پر آکر اپنی ناگواریٔ خاطر کا اظہار کیا اور اپنا کلام پڑھنے سے پہلے جناب صدر اشک امرتسری سے معذرت چاہی۔

مجھے یاد نہیں اشک امرتسری سے میرا باضابطہ تعارف کب اور کس طرح ہوا۔ البتہ جب مجھے کلکتہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بنایا گیا تو اُن سے قُربت کے مواقع میسّر آئے۔ اشک صاحب انجمن کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ ترقی پسند نظریات سے اُن کا تعلق دماغ ہی کا نہیں، دل کا بھی تھا اور اِس لئے وہ فرسودگی اور رجعت پرستی سے کسی طرح کے سمجھوتے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کلکتہ کے وہ شعراء جن کا شمار "اساتذہ" میں ہوتا ہے، اشک مرحوم کے کلام کی غیر متغزّلانہ زبان اور "کھُردرے" موضوعات کی بنا پر اُنھیں شاعر ہی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور اس لئے انھیں "شرفا کی بزم سخن" میں دعوتِ شرکت نہ دی جاتی تھی۔ ترقی پسند حلقے سے وابستہ ہونے کے بعد جب وہ ایسے مشاعروں میں شریک ہوئے جہاں گُل و بلبل اور لب و رخسار کی شاعری اپنا وقار کھو چکی تھی، تو ان کی مقبولیت بڑھنے لگی اور اس طرح وہ حلقہ بھی اپنی محفل میں ان کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوا جو اُن کی موجودگی کو اپنی "نجابت"

کے حق میں خطرہ سمجھتا تھا۔

کلکتہ کے ترقی پسند شاعروں میں پرویز شاہدی کے بعد اشک امرتسری ہی سب سے مقبول شاعر تھے لیکن ابھی اُن کی شہرت کلکتہ کی حدود سے باہر نہ پہنچی تھی کہ ۵۴ء کے اوائل سے ملک کے اہم رسائل میں ان کے کلام کی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ اشک امرتسری کے انتقال کے وقت تک یعنی قریباً پونے تین سال کے عرصے میں اُن کے کلام کی کافی اشاعت ہوئی اور مجھے اردو ادب کی تاریخ میں کسی اور شاعر کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس نے اتنے مختصر عرصے میں مُلک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہو۔

شاعروں کی دنیا میں رشک و حسد ایسے جذبے نہیں ہیں جن پر حیرت کی جائے۔ کلکتہ کے بعض شعرا بھی جو بلاشبہ اشک امرتسری کے مقابلہ میں کمتر شاعرانہ صلاحیت کے مالک تھے لیکن بہت عرصہ تک بزعم خود مشاعروں میں دُھومیں مچا چکے تھے، اشک صاحب کی روز افزوں مقبولیت کے سامنے اپنا چراغ بُجھتا دیکھ کر اُن سے جلنے لگے تھے اور اکثر اوقات اِس جذبے کا مظاہرہ بھی نہایت افسوس ناک طریقے پر کر چکے تھے۔ لیکن اشک صاحب کو میں نے کبھی کسی کی غیبت یا بدگوئی کرتے نہیں سُنا۔ ویسے وہ اظہار خیال اور اختلاف رائے میں بڑے بے باک تھے اور حق گوئی میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔

میں نے اشک امرتسری کو ہمہ اخلاق اور ہمہ انکسار پایا۔ آج کے عام شاعروں کے برعکس وہ خودستائی اور خودبینی کے عیوب سے یکسر پاک تھے۔ اِس میں شبہہ نہیں کہ ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں میں کچھ ایسے مفاد پرست بھی تھے جو ان کو دوسرے شاعروں خصوصاً پرویز شاہدی کا حریف بنانا چاہتے تھے —— وہ اشک صاحب کو دوسروں سے بدظن کرنے کے لئے اُنھیں من گھڑت قصّے سنایا کرتے۔ ایک دفعہ اُنھیں مجھ سے بھی بدگمان کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہُوا یہ تھا کہ شاید "شاہراہ" میں یا "آئینہ" میں اُن کی ایک مطبوعہ نظم دوبارہ چھپ گئی تھی (بعد میں تو خیر ایسا بار ہا ہوا)۔ اڈیٹر کو کسی طرح اس کا علم ہوگیا اور اس نے اشک صاحب سے اس کی شکایت کی۔ یاروں نے اُن دنوں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ سارے اڈیٹروں سے مظہر امام کے بہت ہی قریبی مراسم ہیں اور ہو نہ ہو یہ آگ اُسی نے لگائی ہو گی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے بدنام کیا جاتا تھا کہ میں اپنا ایک ہی کلام چھ چھ مختلف رسائل میں چھپواتا ہوں ۔ ظاہر ہے وہ پتھر کسی ایسے ہی شخص نے اُٹھایا ہوگا جس نے کبھی کوئی "گناہ" نہ کیا ہو ـــــــ یعنی جو بے چارہ رسائل میں اپنی تحریریں چھپوانے کو ترستا رہا ہو ۔ میرا خیال ہے احسان دربھنگوی نے اسی دلیل کی بنیاد پر اشک صاحب کے سامنے میری جانب سے وکالت کی تھی ۔

اشک صاحب چائے خانوں میں اپنے "ہم پیالہ" ہم نشینوں سے ہر طرح کی باتیں سنتے اور شاید پوری توجّہ سے سنتے ۔ لیکن وہ نہ کبھی مشتعل ہوتے اور نہ لگائی بجھائی کی باتوں کو اپنے ذہن و شعور کا حصّہ بننے دیتے ۔ اُن کے مزاج کی سادگی، ان کی اعتدال پسندی اور ان کی فطری معصومیت ان کے دامن کو کسی طرح کی کم ظرفی سے ملوّث نہ ہونے دیتی تھی ۔

اشک امرتسری کی شخصیت سنجیدہ اور متین تھی لیکن وہ خشک مزاج ہرگز نہیں تھے ۔ خود اُن کے کلام میں طنز و مزاح کا جو عنصر ملتا ہے، وہ ان کے مزاج کی شوخی اور شگفتگی کا بیّن ثبوت ہے ۔ یُوں بھی دَورانِ گفتگو میں وہ کبھی کوئی دلچسپ فقرہ کہنے سے چُوکتے نہ تھے ۔ میں نے ہر محفل میں اُن کی بذلہ سنجی اور جملہ بازی کو سرگرم پایا ۔

یادش بخیر، کلکتہ میں ایک صاحب فخر لکھنوی تھے ۔ بے معنی اور ناموزوں "اشعار" کہنے میں یکتائے روزگار ۔ پھر ایک خصوصیت ایسی تھی کہ دنیائے شاعری میں کوئی اُن کا مدّمقابل ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ یہ کہ فخر صاحب اپنے ہر مصرع میں کم از کم ایک بار "بھی" کا استعمال ضرور فرماتے تھے ۔ زیادہ سے زیادہ کے لئے کوئی قید نہیں تھی ۔ جوش، جگر، جمیل مظہری، پرویز شاہدی وغیرہ اُن کے آگے زانوئے ادب تہہ کر چکے تھے ۔ اشک امرتسری کو بھی اُن سے تلمذ کا شرف حاصل تھا ۔ ایک دفعہ اشک نے سالک لکھنوی کے اشتراک سے اپنے "اُستاد" کے اعزاز میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا تھا ۔ مصرع طرح بھی عجیب و غریب تھا ۔ اس کے لئے جو دعوت نامہ بھیجا گیا تھا اُسے اپنی دلچسپی اور ندرت کے پیش نظر ایک یادگار حیثیت حاصل ہے ۔ ملاحظہ فرمایئے ۔

مکرمی! تسلیم

ادب نواز حضرات کو یہ سُن کر مسرّت ہوگی کہ کلکتہ مُسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام سنیچر کے روز بتاریخ ۱۱ جولائی ۱۹۵۴ء بوقت آٹھ بجے شب، بمقام ۶۲/۲ بنٹنک اسٹریٹ کلکتہ، ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر صدارت عالی جناب قدرت مآب مَلِک الشعراء تاج الادب، دبیر اکمل، بہزاد التین، استاد الاساتذہ، سید التلامذہ، فخر الشعراء والادبا رمع الفار

حضرت فخر لکھنوی

منعقد ہوگا۔

اراکین ایسوسی ایشن، سامعین سخن نواز اور شعرائے کرام سے دست بستہ التماس ہے کہ مندرجہ ذیل شرائط کا خیال رکھتے ہوئے شریک بزم ہوں اور صدر محترم مذکور کی ہمّت افزائی فرمائیں۔

شرائط

(۱) وقت مشاعرہ کی پابندی۔
(۲) شعرائے کرام ساڑھے سات شعر سے زیادہ کی غزل پڑھنے کی زحمت نہ فرمائیں۔
(۳) مندرجہ ذیل طرح اور وزن کا خیال رکھیں۔ (بے طرح اور زیادہ وزنی غزل کی اجازت نہیں)
(۴) نظم کی کوئی گنجائش نہیں (یہ بے نظمی کا مشاعرہ ہے)
(۵) شعرائے کرام سیاسی چیزوں بلکہ پوری سیاست سے پرہیز کریں۔ (سیاست ہیں پولس پکڑ لیتی ہے)
(۶) ترقی پسند شعرا سنبھل کر تشریف لائیں اور اپنی غزلیں پہلے تھانہ میں پیش کریں۔

طرح: تفریق تمنّائے اثر ہے گُلِ تر میں

قافیہ: نظر، جگر، در وغیرہ ردیف: میں

آپ کا مخلص: اشک امرتسری۔ سالک لکھنوی

اِس مشاعرے کا ایک "مضحکہ خیز" پہلو یہ تھا کہ ایک دو شاعروں نے بامعنی کلام بھی پڑھا۔ میں نے بھی ساڑھے سات شعر کی ایک غزل بہ رنگ غالب پیش کی تھی جس کے دو شعر اس وقت یاد آرہے ہیں۔

ہے مصحفِ رُخ زلف بکف جلوہ تریں | سُو فارِ نظر، عشوۂ مژگانِ جوانی
آشفتگیٔ کشتیٔ مہ بھی ہے بھنور میں | خورشیدِ فلک سیر ہے آزردۂ طوفاں

آج اِن اشعار کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ مجھ میں "جدید تر" شاعر بننے کے جراثیم بہت پہلے سے موجود تھے۔ ممکن ہے اشک امرتسری وغیرہ نے نئی شاعری کے لئے فضا سازگار بنانے کی غرض ہی سے یہ سازش کی ہو۔

میرے عقد کے موقع پر میرے طویل قامت کی رعایت سے اشک صاحب نے دو شعر کہے تھے جو اُن کی طبعی ظرافت پسندی کا اظہار ہیں۔ یہ اشعار مجید عبدل کے نام سے شائع ہوئے تھے۔

کہ سرِ عرشِ تخیّل نظر آیا سہرا | آخر ش آ ہی گیا عشق میں عبدل وہ مقام
کس بلندی پہ ہے تنزنگ نے چڑھایا سہرا | دیکھ اے بنت ہمالہ! قدِ بالائے امام

اشک امرتسری جس مکان میں رہتے تھے یا جہاں اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا وہ جگہ میری جائے رہائش سے بہت قریب تھی۔ میرا ان کی ملاقات کے لئے جانا یا ان کا مجھے ملاقات کی مسرّت بخشنا کوئی خلاف معمول بات بھی نہیں تھی۔ لیکن شاید ہم دونوں کی کم سخنی کے باعث ہمیں ایک دوسرے سے بہت قریب آنے کا موقع نہ مل سکا، اور اس طرح میں اُن کی زندگی کے نشیب و فراز اور اہم واقعات سے گویا ناواقف رہا۔ اتنا معلوم ہے کہ اُن کا نام محمد امین تھا، لیکن یہ پتہ نہیں کہ وہ کس سنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یوں دیکھنے میں ان کی عمر پچاس پچپن کے درمیان تھی۔ ایک بھائی شانتی نکیتن میں پروفیسر رہ چکے تھے اور دوسرے بھائی اِسحاق امرتسری اپنی علمی استعداد اور صحافیانہ تجربہ کاری کے لحاظ سے کلکتہ کی مغتنم ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور شاید اب بھی وہیں ہیں۔

اشکؔ امرتسری اوائل عمر ہی سے گھر سے باہر رہے اور بنجاروں کی سی زندگی گذارنے
میں انھیں زیادہ لطف آتا رہا۔ وہ مجمع اکٹھا کر کے دوائیں فروخت کیا کرتے تھے۔ یہی ان کا
ذریعۂ معاش تھا۔ شادی اُنھوں نے عشق کے نتیجے میں کی تھی۔ گو اُن کی شکل وصورت دیکھ کر
شاید ہی کوئی یقین کر سکتا تھا کہ انھوں نے کبھی عشق کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ صنف مخالف نے
عشق تو خیر کیا کیا ہوگا، ترس کھا کر شادی کر لی ہوگی۔ ویسے بعض رازدار لوگوں کا کہنا ہے کہ ترس
اشکؔ صاحب کو بھی آیا تھا۔ باقی علم اللہ کو ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ کم سخن تھے اس لئے ابتدائی ملاقاتوں میں یہ اندازہ
لگانا مشکل تھا کہ وہ اپنا کلام خود لکھتے ہیں، یا کسی اور سے لکھواتے ہیں۔ یہ ایک عام خیال ہے
کہ نظیر اکبر آبادی کا کامیاب ترین تتبع اشکؔ امرتسری کے یہاں ملتا ہے۔ اشکؔ کی شاعری
سے بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔ یوں بھی یہ کام میرا نہیں، نقادوں کا ہے۔ البتہ اس
حقیقت کے اظہار کے لئے نقاد ہونے کی سند پیش کرنا ضروری نہیں کہ اشکؔ نہ تو نظیر اکبر آبادی
کے نقال تھے اور نہ ان کی نقل۔ البتہ اُنھوں نے نظیرؔ کے رنگ واسلوب کو نئی زندگی کے
نئے مسائل سے ہم آہنگ کیا تھا۔ اُنھوں نے خود عُسرت اور مفلوک الحالی کی زندگی بسر کی تھی۔
زمانے کی صعوبتوں کو جھیلا تھا اور اس کرب کو شعوری طور پر اپنی نظموں میں جگہ دی تھی۔ انھوں
نے شبستانوں میں بیٹھ کر غربت اور افلاس کے گیت نہیں گائے تھے۔ عوامی فن کا نعرہ لگانے
والے عوامی فن کی ماہیت سے ناآشنا رہے۔ اشکؔ امرتسری نے کسی دعوے کے بغیر
اپنے کلام سے یہ شہادت پیش کی کہ اچھی عوامی شاعری کیا ہوتی ہے؟

اشکؔ کے یہاں نظیرؔ کا سا' الفاظ کا ذخیرہ نہ تھا۔ زندگی کے متنوع مظاہر کا
اتنا تجربہ بھی نہ تھا جتنا شاید نظیر اکبر آبادی کو تھا۔ اس لئے کہیں کہیں اشکؔ کے یہاں تصنع
پیدا ہوتا ہے اور کہیں کہیں ایک ہی نظم میں نظیرؔ اور جوشؔ کا رنگ بیک وقت جھلکتا ہے
جس کی وجہ سے اُن کا اپنا اُسلوب پوری طرح نکھر نہیں پاتا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اشکؔ
کی بہت سی کامیاب نظمیں مثلاً "پیسہ" "بچے کی غوں غاں" "کوئل کی کوک" "روٹیاں"

"بنجارہ نامہ" "تب دیکھ بہار کلکتہ" "رکشا والا" وغیرہ نظیر کے طرز و رنگ ہی میں نہیں، اُن کی پسندیدہ بحروں میں بھی لکھی گئی ہیں، لیکن اشک امرتسری کے کلام پر جوش کا رنگ بھی گہرا ہے جو اُن کی نظم "خط کا جواب" میں ایک خوبصورت شکل میں ظاہر ہوا ہے، ورنہ اکثر نظموں میں گراں گذرتا ہے۔ اشک کو میں نظیر کا مُقلد ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے نظیر کی صحت مند روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ افسوس ہے کہ وہ نظیر کی بعض اُن صفات سے محروم تھے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، ورنہ ان کی تخلیقات زیادہ ہمہ گیر اور حقیقی ہوتیں اور ان کے موضوعات بھی زیادہ وسیع ہوتے۔

اپنی موت سے قریباً دو سال قبل اشک امرتسری کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو گئے تھے۔ علاج معالجہ کا مناسب بندوبست نہ تھا اس لئے ان کی صحت روز بروز گرتی رہی۔ کام کاج کے قابل نہیں رہے۔ پیسہ پیسہ کو محتاج ہو گئے لیکن غیرت اور خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جب حالات کسی طرح قابلِ برداشت نہ رہے اور احباب کا اِصرار بھی شدید ہو گیا تو وہ اس بات کے لئے رضامند ہو گئے کہ اُن کے لئے فنڈ کی اپیل کی جائے۔ اشک امرتسری کی مقبولیت مسلّم۔ لیکن مشاعروں میں "واہ واہ" کرنے والوں نے کئی ماہ کی اپیل کے بعد جو رقم بھجوائی، وہ ایک ہزار سے زائد نہ ہو سکی۔ کینسر جیسے مرض کے لئے ہزار روپے کی کیا وقعت تھی۔ البتہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ لیکن مرض کی شدت کے سامنے تِنکے کا سہارا بے معنی ہو کر رہ گیا۔ آخر ۲۰ ستمبر ۵۶ئہ کو صبح کے چار بجے مُوت کے جابر تھپیڑے نے اشک امرتسری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔

اُس دن مسلسل بارش ہو رہی تھی! یہ کس کے آنسو تھے؟ اللہ کی آنکھوں میں تو کبھی آنسو نہیں آتے!

دوپہر کو شائع ہونے والے مقامی اخباروں میں اشک کے انتقال کی خبر شائع ہوئی، لیکن اس کے باوجود بہت سے مدّاحوں اور دوستوں کو اطلاع نہ ہو سکی اور وہ جنازہ میں شرکت سے محروم رہ گئے۔ اشک جیسے شاعر کی تدفین کے وقت بمشکل تیس چالیس افراد موجود ہوں گے شریک

ہونے والے ادیبوں اور صحافیوں میں پرویز شاہدی، سیّد محمود طرزی، ناوک لکھنوی، شہزاد منظر، اصغر راہی، اقبال اکرامی، فاتح فرخ اور سنجر عظیم آبادی کی شکلیں حافظے میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ اپنی وفات سے چند ماہ قبل اشک نے کہا تھا ؂

میرے رہتے مرے رستے میں بچھائے کانٹے

میری تربت پہ چڑھائے گُلِ تر میرے بعد

اشک کی یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی، ان کے رستے میں کانٹے بچھانے والے اُن کی تربت پر کیا پھول چڑھاتے۔ اُن کے دوستوں کو بھی یہ توفیق نہ ہوئی۔ اب تو ان کی تُربت کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔

مجھے اُردو ادب میں سر دست کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جو اشک کی جگہ لینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کی شاعری کا لب و لہجہ دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ ستاروں کی محفل میں ایک ایسے ستارے کی مانند تھے جو سب سے تنہا اور الگ دکھائی دیتا ہو۔ رنج یہ ہے کہ وہ شہابِ ثاقب کی طرح آسمانِ ادب پر چمکے اور اس سے پہلے کہ اپنے کنوئیں میں محبوس نقّادوں کی نگاہیں اُن پر پڑیں، وہ اپنی تابناکی دِکھا کر اچانک فضا کی تیرگی میں گُم ہو گئے!

آج اشک امرتسری کے انتقال کو گیارہ سال بیت گئے۔ ان کے کلام کا ایک مختصر انتخاب پچھلے دنوں چھپا، مگر اس کی اشاعت بہت محدود رہی[1]۔ کسی نقّاد نے ان کی شاعری پر کوئی مقالہ نہیں لکھا[1]۔ کسی انتخاب میں ان کا کلام شامل نہیں کیا گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ جب لوگ میرا مضمون پڑھیں گے تو حیرت سے پوچھیں گے:

"کون اشک امرتسری؟"

میں نے اپنے آپ سے یہی سوال ۱۹۵۱ء میں کیا تھا!

[1] حیدر آباد کے صحافی اور کارٹونسٹ وہاب حیدر کے چھوٹے بھائی 'ہر شے' کو اُلٹی نظر سے دیکھنے کے عادی۔ اپنا نام بھی اُلٹ کر عبدالمجید سے مجید عبدل کرلیا

تھا۔ کلکتہ میں اِن دونوں بھائیوں کے گھر پر "خالص دیسی مشروب" کی محفل میں مخدوم محی الدین کے ساتھ شریک ہونے کی مسرّت مجھے بھی حاصل ہوئی ہے۔

ؔ ظ۔ انصاری نے "آئینہ" دہلی میں اشک امرتسری کی نظم "پیسہ" شائع کرتے ہوئے لکھا تھا: "ان کی یہ نظم اپنی روانی، بے تکلفی اور جذبے کی آنچ سے خود نظیر اکبرآبادی کے فن اور کلام کو عہد حاضر کا مزاج عطا کرتی ہے۔ صحت مند روایت کا بدلتے ہوئے حالات میں زندہ رہنا اسے کہتے ہیں۔" اس وقت بحیثیت نقاد ظ۔ انصاری کا کوئی خاص مرتبہ نہیں تھا۔

ؔ شاہراہ بکڈپو، دہلی کے مالک محمد یوسف جامعی نے مجھ سے بارہا فرمائش کی (کلکتہ میں بھی اور دہلی میں بھی) کہ میں ان کے لئے اشک امرتسری کا ایک مجموعہ مرتب کردوں، مگر اشک صاحب کی بیاضیں ان کے "مخلص" دوستوں کے پاس رہیں جو انہیں حرزجاں بنائے بیٹھے رہے۔ ۶۵ء میں انجمن ترقی اُردو کلکتہ نے اشک صاحب کے کلام کا ایک انتخاب "سیلِ اشک" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کے مرتب علقمہ شبلی اور اعزاز افضل ہیں، اور پرویز شاہدی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔

ؔ اکتوبر ۵۸ء میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے "فلم ویکلی"، کلکتہ کا "اشک امرتسری نمبر" شائع کیا تھا۔ اخباری سائز کے پانچ صفحات میں فائز آصفی، سید حرمت الاکرام، اویس احمد دوراں، عاجز انصاری، احمد سلیم، شہزاد منظر اور راقم الحروف کے مضامین تھے۔

● ۱۹۵۷ء

نظرثانی ۱۹۶۷ء

جمیل مظہری

جمیل مظہری کے نام سے پہلی بار، اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے، میرے کان اُس وقت آشنا ہوئے، جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن کے جو اشعار پہلے پہل سُننے میں آئے، وہ آج بھی ذہن میں تر و تازہ ہیں:

به قدرِ پیمانۂ تخیّل، سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دَم نکل جائے آدمی کا

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے: اس جام میں ہے تلخیٔ عمل
پر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گِن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

پہلے شعر کا پہلا مصرع عرصے تک فہم سے بعید رہا۔ خصوصاً اس کا پہلا ٹکڑا —— "بہ قدرِ پیمانۂ تخیل"۔ اُن دنوں میرے وطن دربھنگے میں بس دو تین شخصیتیں ایسی تھیں، جن تک میری رسائی تھی اور جن سے میں شعر و ادب کے بارے میں اپنے بعض سوالات کے حل تلاش کر سکتا تھا۔ ایک —— ضلع اسکول میں میرے اُستاد ثاقب عظیم آبادی تھے، جو عروض اور زبان و قواعد پر پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ دوسرے، ہمارے ایک عزیز مولانا عبدالعلیم آسی، جو مسلم اسکول میں مدرس تھے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے فارغ التحصیل، عربی اور فارسی ادب کے رسیا، خلوت میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کرتے اور جلوت میں سیرت النبیؐ پر تقریر کرتے۔ اور تیسرے —— میرے ماموں دہر ناصری جو میٹرک پاس کر کے بے کار بیٹھے تھے اور اپنا وقت اساتذہ کے کلام سے تذکیر و تانیث کی سند حاصل کرنے اور لغت سے الفاظ کا صحیح تلفظ دریافت کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے گفتگو ہو رہی تھی۔ اُس وقت کے بعض اہم ترین شعرا کی، جوش کی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کی۔ میں نے پوچھا: "کیا ہمارے صوبے میں اُن کے مرتبے کا کوئی شاعر نہیں ہے؟"

جواب ملا: "علامہ جمیل مظہری"۔

میں نے چونک کر پوچھا: "علامہ کیا؟"

سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ میں نے علامہ اقبال تو سنا تھا، لیکن نہ علامہ میر، نہ علامہ غالب۔ جوش، حفیظ اور احسان دانش کے نام کے ساتھ بھی "علامہ" نہیں۔ پھر جمیل مظہری کے ساتھ کیوں؟ اور وہ بھی ۳۵-۳۶ سال کی عمر میں۔

جس سال کا میں ذکر کر رہا ہوں، اسی سال ہمارے شہر سے ایک ادبی ماہ نامہ "ہمالہ" کا اجرا ہوا، جس کے ادارے میں ش۔ مظفر پوری، سید حسنین جامعی اور عبدالعلیم آسی تھے۔ اس کے دوسرے شمارے (جولائی ۱۹۴۱ء) میں علامہ جمیل مظہری کی ایک غزل دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ اتنے بڑے شاعر نے ہمارے شہر کے ایک رسالے سے تعاون کیا ہے۔ بے مطلع کی اس غزل کے چند شعر یہ تھے:

پلٹ دیا ہے حوادث نے رُخ زمانے کا
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی
اُتر، بلندیٔ تخیل سے اُتر، اے دوست!
کہ اب جہاں میں نظر کوئی دور بیں نہ رہی
نیاز و ناز کی دنیا میں انقلاب آیا
صنم صنم نہ رہے اور جبیں، جبیں نہ رہی
جہاں میں خشک ہے کشتِ حیات و مزرعِ عشق
کہ خونِ پاک مسلماں سے تر زمیں نہ رہی

"ہمالہ" کا تیسرا اور آخری شمارہ اگست ستمبر ۱۹۴۱ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔ "ہمالہ" کے بند ہوتے ہی اکتوبر میں ہمارے شہر سے ایک اور رسالہ "حسن و شباب" جلوہ گر ہوا، جس کے مدیر مطیع الرحمٰن غوثی تھے اور مجلسِ ادارت میں میرے ماموں دہر ناصری کا بھی نام تھا۔ اس رسالے کا اداریہ جمیل مظہری کے اس شعر سے شروع ہوا تھا:

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

جمیل مظہری کی شخصیت بہار میں تیزی کے ساتھ LEGEND بنتی جا رہی تھی۔ ان کے اِرد گِرد ایک ہالہ سا تھا۔ ان کی علمیت کا، ان کی قادر الکلامی کا، ان کی مجذوبیت کا، ان کی ہیئت کذائی اور بے نیازی کا۔ سُن سُن کر اُن کی پُروقار لیکن عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں طرح طرح کے تصوّرات ذہن پر حاوی تھے۔ ان سے ملنے کی ہمّت نہیں تھی۔ البتہ دُور سے دیکھنے کا اشتیاق حد سے بڑھا ہوا تھا، مگر جمیل مظہری کبھی پٹنہ تھے، کبھی کلکتہ، کبھی بمبئی۔ میں شمالی بہار کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقیّد تھا۔

کالج پہنچا تو وہاں اخترؔ قادری جیسے اُستاد ملے، جو خود ایک خوش گو شاعر اور

اپنے وقت کے ہونہار افسانہ نگار تھے۔ اقبالؔ کو اُنہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ علامہ جمیلؔ مظہری کا ذکر کرتے وقت اُن کی گُل افشانیٔ گفتار دیر تک اپنی خوشبو پھیلاتی رہتی۔ انہی دنوں کہیں سے "ندیم" گیا کا "بہار نمبر" ۱۹۳۳ء ہاتھ لگا، جس میں جمیلؔ مظہری کی وہی مشہور غزل تھی، جس کا مطلع ہے۔ "بہ قدرِ پیمانۂ تخیّل ...." اور پھر اسی رسالے کا دوسرا بہار نمبر ۱۹۳۵ء نظر آیا جس میں ان کا ایک افسانہ بھی تھا —— "فرض کی قربان گاہ پر"۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی:

"دو بھولے بھالے حسین بچّے گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے۔ کھیل رہے تھے اور گھروندے بنا رہے تھے — بنا رہے تھے اور توڑ رہے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ میں ایک گُڑیا تھی، کپڑے کی ایک خوبصورت گڑیا۔ معصوم جذبات کا کھلونا۔ نابالغ ذوقِ نظر کے لئے ایک حسین دھوکا — بڑے کے مضبوط پنجوں نے چھوٹے کے کمزور ہاتھوں سے وہ گڑیا چھین لی۔ چھین لی اور لے بھاگا۔ گڑیا چھن گئی۔ بغیر کسی عذر کے، ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی ...."

پندرہ سال بعد یہ افسانہ کتابی صورت میں "شکست و فتح" کے نام سے چھپا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خود جمیلؔ صاحب کی داستانِ محبّت ہے۔ یہ بچّہ بڑا ہو کر علامہ بنا، لیکن جو گڑیا اُس کے ہاتھ سے چھِن گئی تھی، اس کے لئے وہ آخر دم تک ترستا رہا۔ حتّٰی کہ ۳۵ سال کی عمر میں اُس نے لکھا:

یہ میری آگ یوں کجلا نہ جاتی میرے سینے میں
اگر اس آگ کو بھی تاپنے والے ملے ہوتے

روایت ہے کہ عنفوانِ شباب میں جمیلؔ مظہری نے ٹوٹ کر محبّت کی تھی۔ اپنے رشتے کی ایک پردہ نشین لڑکی سے۔ یہ محبّت، ظاہر ہے، افلاطونی نوعیت کی تھی، اور ہر چند دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی، مگر دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے۔ مجھے اس کا سبب معلوم نہیں۔ میں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیوں کہ المیہ بہرحال المیہ ہے، خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ ممکن ہے کوئی فرض دامن گیر ہو، یا عزم و ہمّت کی کمی ہو، یا بزرگوں کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔

اپنی محبت کے سلسلے میں اُنہوں نے کہا ہے کہ وہ اس پر فلسفے کی خاک ڈالتے رہے :

مگر شکن بہ ابروئے زمانہ ہم نہ بن سکے
کہانی ہم نہ بن سکے فسانہ ہم نہ بن سکے

یہ صحیح ہے کہ وہ خود افسانہ نہ بن سکے، لیکن اُنہوں نے بہ نفسِ نفیس اپنی ناکام محبت کا افسانہ لکھا۔ اُنہوں نے رومانی نظمیں بھی اچھی خاصی تعداد میں لکھی ہیں اور ہر چند کہیں کہیں اختر شیرانی کے اثر کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ان کی کامیاب رومانی نظموں میں خود ان کا انفرادی احساس جادو جگاتا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی محبت کا قصہ منظوم کیا ہے :

وہ لڑکپن کے گھروندے میں جوانی کا کھیل
اور اس کھیل کا اک فتنۂ فردا ہونا
عشق معصوم کے وہ غیر شعوری اقدام
یعنی رخساروں پہ رخسار کا رکھا ہونا
وہ مرے عشق کے چرچے، وہ بزرگوں کا عتاب
وہ ترا پردے میں چھُپنا، مجھے سودا ہونا

لیکن اس دور کی سب سے خوبصورت اور اثر انگیز نظم "ڈرو، خدا سے ڈرو" ہے، جس میں وہ محبوبہ، جو اَب پرائی ہو چکی ہے، شاعر کو مخاطب کرتی ہے :

اِدھر اُدھر نظر اُٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ — ڈرو خدا سے، ڈرو

جھنجھوڑ کر نہ جگاؤ، کہ سو گیا ہے یہ دل
کئی برس سے عزا خانۂ وفا ہے یہ دل
خدا گواہ کسی کی محل سرا ہے یہ دل
پرائے گھر میں نہ آؤ — ڈرو خدا سے ڈرو

جمیلؔ مظہری نے ایک عرصے تک شادی نہیں کی۔ جب بھی ایسی کوئی تجویز آتی، ٹال جاتے۔ اپنی پہلی محبت کو سینے سے لگائے رہے۔ لوگ کہتے ہیں اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلے میں وہ خود کفیل تھے۔ ایسا شخص بنیادی طور پر مخلص ہوتا ہے۔ منٹوؔ نے میراجی کے خاکے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشخاص جو اپنی خواہشاتِ جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں، مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہے، وہ ظاہر ہے۔"

جب دوستوں اور عزیزوں کا اصرار شدید ہوا تو انہوں نے چالیس سال کی عمر میں مٹیا برج کی ایک بیوہ سے شادی کر لی۔ ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم ہوئے یا نہیں، اس کے بارے میں اُن کے دوستوں نے بھی کوئی حتمی بات نہیں بتائی۔ میر محمود طرزیؔ نے جو علامہ کے بڑے بے تکلف دوست تھے، ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ دراصل وہ عورت ان کے پلّے منڈھی جانے والی تھی، علامہ شادی کے لئے تیار ہو گئے تو ان کی گلو خلاصی ہوئی۔ شاید یہ بات انہوں نے محض تفننِ طبع کے لئے کہی تھی۔ علامہ کے ایک عزیز شاگرد جو رازِ درونِ پردہ کے واقف کار ہونے کے دعوے دار رہے ہیں، کہا کرتے تھے کہ علامہ کی بیوی ان کی گندگی کے باعث انہیں اپنے بستر پہ بیٹھنے نہیں دیتی تھیں اور ان کے رخصت ہونے پر کمرے کے فرش کو دھلوایا کرتی تھیں۔ ممکن ہے یہ بیان مبالغے پر مبنی ہو، لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کا اپنی بیوی کے یہاں آنا جانا بند تھا۔ البتہ وہ انہیں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ایک مقررہ رقم بھیج دیا کرتے تھے۔ علامہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی اس محرومی کو بھولنے کے لئے انہوں نے اپنے بھائی اور بہن کے بچوں کو باپ کی محبت بخش دی تھی اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ وہ اُن پر ہی صَرف کرتے تھے۔ اپنی ذات پر اُن کا خرچ سَو سَوا سَو روپے سے زیادہ نہ تھا۔

۱۹۴۹ء میں میرے بہنوئی منظر شہاب ایم۔ اے کی تعلیم کے لئے پٹنہ گئے تو انہیں وہاں دو اہم نعمتیں اُستاد کے طور پر ملیں ـــــ جمیل مظہری اور اختر اُورینوی۔ منظر شہاب، جب چھٹیوں میں دربھنگہ آتے تو علّامہ کے بہت سے قصّے بھی ساتھ لاتے، اور ہم مل کر اُن سے لطف اندوز ہوتے۔ ہم لوگوں نے دربھنگے سے ایک ترقی پسند ادبی جریدہ "نئی کرن" کا اجرا کیا تھا، جو اپنے وقت کا اچھا خاصا معتبر رسالہ بن گیا تھا۔ اس کے صرف تین شمارے لمبے لمبے وقفوں پر شائع ہوئے۔ تیسرے شمارے کے لئے منظر شہاب کی فرمائش پر علّامہ نے ایک غزل، جو رسالے کے مزاج کے مطابق خالص ترقی پسندانہ تھی، عنایت کی تھی، جس کے ایک دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں :

شبِ ہجراں! وہاں تیری درازی کون ناپے گا
جہاں فاقہ کشوں کے دن بڑی مشکل سے ڈھلتے ہیں
محبّت جن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز رکھتی ہے
وہ اکثر وقت کی رفتار سے آگے بھی چلتے ہیں

انہیں دنوں پٹنہ سے بھی ایک ترقی پسند رسالے "نئی راہ" کا اجرا ہوا تھا۔ اس کے لئے جمیل صاحب نے بطورِ خاص ایک نظم دی تھی ـــــ "نئے ادب کی زبان"۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں :

بہت اونچا غبارِ راہِ امکاں کر دیا ہم نے
بلندی کو قریبِ ذہنِ انساں کر دیا ہم نے
دلِ مزدور سے قطرے نچوڑے خونِ ارماں کے
اور ان سے وقت کے سینے میں طوفاں کر دیا ہم نے
محبّت نے جو دی تھی آگ اس کا یوں لیا مصرف
کہ گرم اس سے تنورِ قلبِ دہقاں کر دیا ہم نے

فرمائشوں کی یہ تعمیل محض مروّت اور اپنے شاگردوں کی دلداری تھی، یا ترقی پسندی سے جذباتی وابستگی؟ اس کے بارے میں دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ وہ خود انجمن ترقی پسند مصنّفین سے باقاعدہ کبھی وابستہ

نہیں رہے، مارکسزم کے تھوڑے بہت اثر کی بات اور ہے لیکن شاید اس سے کبھی والہانہ لگاؤ نہیں رہا۔ وہ ترقّی پسندوں کی شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ ترقّی پسندوں کی اشتراکیت سے قطع نظر، مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی اُس وقت کی شاعری کا عام مزاج تھا۔ "نئی کرن" اور "نئی راہ" کے لئے رنگِ محفل دیکھ کر ہی جمیلؔ مظہری نے اپنا کلام پیش کیا ہوگا۔

میں نے جیسے جیسے جمیلؔ مظہری کی شاعری اور ان کی نثر کا مطالعہ کیا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ تضادات کا ملغوبہ تھے۔ کبھی تشکیک اور الحاد اور کبھی شدید مذہبیت، کبھی جذبے کی آنچ اور کبھی فلسفے کی راکھ، کبھی عقل کی سرپرستی اور کبھی جُنوں کی پاسداری، کبھی بھارت ماتا پر خدا کی رحمت اور کبھی ساری کائنات ایک ذرّہ حقیر، کبھی رسول اللہؐ کی سیاسی غلطیوں کی طرف اشارے، کبھی اُنؐ کے نواسے کی شہادت پر مرثیے ہی مرثیے۔ کبھی خونِ پاکِ مسلماں سے زمیں کے تر نہ ہونے کا دُکھ اور کبھی بُدھ اور جین مذہب کی خوبیوں پر عالمانہ بحثیں۔ ابوالکلام آزاد سے عقیدت، جوشؔ اور نیاز فتح پوری سے ذہنی قربت و موانست۔

شادؔ عظیم آبادی کے بعد بہار میں تین اہم شاعروں کی ایک تثلیث بن گئی تھی — جمیلؔ مظہری، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی۔ تینوں ہم عصر ہی نہیں، ایک دوسرے کے حریف بھی تھے اور اس سے زیادہ دوست۔ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے ۱۹۵۱ء کے اواخر میں صحافی بننے کے ارادے سے کلکتہ پہنچا۔ چند ہی ماہ بعد ایک ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ کچھ عرصہ بعد اس اسکول میں پرویز شاہدی ہیڈ ماسٹر ہو کر آئے تھے۔ ایک تو رفیق کار ہونے کے باعث، دوسرے نظریاتی ہم آہنگی کے سبب ان سے جلد ہی بہت ہی قریبی مراسم قائم ہو گئے۔ اسکول ہی میں پہلی بار ۱۹۵۴ء میں اجتبیٰ رضوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں راجندر کالج چھپرہ میں شعبہ اردو و فارسی کے صدر تھے۔ ان کا مجموعہ "شعلہ ندا" نیا نیا شائع ہوا تھا۔ اس وقت بھی اُن کی داڑھی اُن کا شناخت نامہ تھی۔ پرویز شاہدی سے اس صحبت میں، اُن کی جس نوعیّت کی باتیں ہوئی تھیں، انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی جرأت

مجھ میں نہیں ہے۔ جمیلؔ مظہری سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی، اب حافظہ رہنمائی نہیں کر رہا ہے۔ قیاس ہے کہ کلکتہ میں ہی ہوئی ہوگی۔ جمیلؔ صاحب کے چھوٹے بھائی رضا کاظمی مظہری مستقل طور پر کلکتہ میں رہتے ہیں۔ اُن دنوں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اُن سے ادبی اور شعری محفلوں کے علاوہ پرویزؔ صاحب کے گھر پر کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ جمیلؔ مظہری اپنے بھائی کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ یوں بھی جمیلؔ صاحب کے بیشتر احباب کلکتہ میں تھے۔ ان کے استاد وحشتؔ کلکتوی ڈھاکہ جا چکے تھے، لیکن کبھی کبھی کلکتہ آجاتے۔ جمیلؔ صاحب کا کلکتہ سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ان کی تعلیم وہیں مکمل ہوئی۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز وہیں ہوا۔ ان کی شاعری وہیں پروان چڑھی اور آہستہ آہستہ بنگال اور بہار کی مجموعی ادبی فضا پر چھا گئی۔ جمیلؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات پرویزؔ صاحب کے گھر پر ہوئی یا رضا مظہری کے یہاں یا "بزم احباب" کی کسی نشست میں، صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ۵۲ء کے وسط تک ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔

"بزم احباب" کلکتہ کے شرفا کی ادبی انجمن تھی، اور اس کا ممبر بننے کے لئے کسی "شریف" ممبر کی تجویز اور تمام "شریف" ممبروں کی تائید ضروری تھی۔ نوجوانوں اور نوواردوں کو اس انجمن میں باریابی کا شرف مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک دو بار کی شرکت کے بعد ہی مجھے شرافت کی سند مل گئی تھی۔ اسی بزم کی ایک نشست میں جمیلؔ مظہری سے پہلی مرتبہ اپنے چند اشعار کی داد پاکر اپنے شاعر ہونے کا یقین سا ہو گیا تھا۔

علامہ کے بارے میں مشہور تھا کہ مشاعروں اور نشستوں میں بھی اُن پر گُم شدگی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ گُم شدگی سے بیداری کے عالم میں آئے اور کوئی شعر پسند آگیا تو اُن کی "واہ واہ" کی تکرار سے محفل گونجنے لگتی ہے۔ اور شاعر ہے کہ آگے کے اشعار پڑھ رہا ہے۔ اور جمیلؔ صاحب ہیں کہ اپنے پہلے کے پسندیدہ شعر پر داد دیئے جا رہے ہیں۔ میں نے خود جب انہیں محفلوں میں دیکھا تو اس کی تصدیق ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک بار "بزم احباب" ہی کی ایک نشست میں، جب میں نے یہ شعر پڑھا:

دونوں ہی راہ میں ٹکراتے چلے جاتے ہیں
عشق اور عقل کی یہ ہم سفری تو دیکھو

تو بے ساختہ "واواواواوا...." کا وِرد کرنے لگے اور بار بار کہتے: "یہ شعر آپ نے کہا ہے..... اِس عمر میں۔" جی چاہا کہہ دوں: "جی نہیں، آپ نے کہا ہے۔" ان کی "واہ واہ" ہمیشہ "وا وا وا" ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو آواز بھی غائب ہو جاتی تھی اور صرف تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹ دکھائی دیتے تھے۔ اس غزل کے باقی اشعار پر اہلِ محفل نے تو داد دی، لیکن جمیلؔ صاحب بالکل خاموش رہے۔ ان پر کوئی اور محویت طاری تھی۔

کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ علّامہ کے ذہن میں شعر کسی اور کا ہوتا اور وہ داد کسی اور کو دے رہے ہوتے۔ اب میں اپنے شعروں پر دی ہوئی اُن کی داد کے بارے میں سوچتا ہوں تو کئی اندیشے سر اُٹھاتے ہیں۔ جمیلؔ صاحب داد کے معاملے میں بہت فراخ دل تھے، اور لوگوں کو غلط فہمیوں اور خوش گمانیوں میں مبتلا کرانے میں ماہر تھے۔ عموماً ایسا لگتا کہ اُن کی داد بے ساختہ ہے اور اس میں ان کا خلوص شامل ہے۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت معمولی درجے کے شعروں پر بھی حد سے زیادہ مبالغہ آمیز داد دے رہے ہیں، تو ان کی "مسلسل واہ واہ" کی اہمیت میری نظر میں گھٹ گئی۔ ایک بار میں نے ان سے عرض کیا تھا: "آپ کی داد پر کبھی کبھی مبالغے کا شبہ ہوتا ہے۔ آپ نے ایک نوخیز شاعر سے کہہ دیا کہ تمہاری غزل جگرؔ سے بہتر ہے، اور وہ ہر جگہ اس بیان کو سند کے طور پر استعمال کرتا پھرتا ہے۔"

علّامہ میرے بیان کی تلخی کو نظر انداز کر گئے۔ کہنے لگے: "کبھی کبھی تو مجھے کوئی شعر واقعی پسند آتا ہے، اور میں اپنی پسندیدگی کا برملا اظہار کرتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میری داد ہجوِ ملیح ہوتی ہے۔"

ہجوِ ملیح کی اصطلاح میرے لئے نئی نہیں تھی، لیکن اس کی معنویت مجھ پر اسی وقت آشکار ہوئی۔

شاعری میں جمیل مظہری کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تو نہیں تھا، لیکن کچھ شعراء اُن کے دامنِ فیض سے باقاعدہ طور پر وابستہ تھے۔ جمیل مظہری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دوسروں کو اپنا کلام بخش دیتے ہیں اور مشاعروں میں جب اُن شاعروں کو داد ملتی ہے تو اُنہیں اپنی تعریف سمجھ کر پھُولے نہیں سماتے۔ اور خود بھی اُنہیں داد دینے میں آگے آگے رہتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کا شاید ہی کوئی شعر سلامت رہنے دیتے تھے۔ دراصل جمیل صاحب کا ایک مخصوص شعری مزاج تھا، ان کا ایک خاص ڈکشن اور اسلوب تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو اسی مزاج سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے تھے اور جہاں جہاں وہ فکر اور لہجے کے اعتبار سے اُن کے نزدیک نظر نہ آتے، اُن پر عملِ جرّاحی شروع کر دیتے۔ نتیجے کے طور پر اصلاح کے بعد شاعر کے کلام میں اُس کا اپنا خون شاذ ہی باقی رہ جاتا تھا۔ اس لئے کسی غیرت مند کے لئے اُن کا شاگرد بنے رہنا کافی صبر آزما تھا۔ سہیل جمیلی کو غیرت آئی تو وہ سہیل عظیم آبادی بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ میر محمود طرزی کا کافی کلام جمیل مظہری کا ہی عطا کردہ تھا۔ حالاں کہ اوّل الذکر ہمیشہ اپنے آپ کو وحشت کلکتوی کا شاگرد کہتے رہے۔ کسی شاعر کا جمیل مظہری کے قریب آنا خطرے کا باعث تھا۔ یعنی اُس پر انگلیاں اُٹھنے لگتی تھیں کہ ہو نہ ہو یہ جمیل صاحب سے استفادہ کرتا ہے، اور استفادہ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اُن سے پوری کی پوری نظم یا غزل لکھوا تا ہے۔

اپنے بھائی سے رضا مظہری کی محبت اور عقیدت مثالی ہے۔ دو بھائیوں میں اتنی قربت اور یگانگت فی زمانہ شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر رضا مظہری نہ ہوتے تو جمیل مظہری کا بیشتر کلام زمانے کی دست برد سے زیادہ خود ان کی دست بُرد سے ضائع ہو چکا ہوتا۔ رضا مظہری اپنے رنگ کے خوش کلام شاعر ہیں۔ ان کی شاعری جذبے اور احساس کی شاعری ہے، اور اس لئے اُس کا شاعرانہ اسلوب بھی اُن کے جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ وہ جمیل مظہری کے شاگرد نہیں۔ اس لئے اُن کے یہاں ڈھونڈے سے بھی جمیل مظہری کے اثرات نہیں ملیں گے۔ معلوم نہیں رضا صاحب کا مزاج ہی یہی ہے، یا اس میں ان کی شعوری

کوشش کو بھی دخل ہے کہ وہ ہر چند اپنی ذاتی زندگی میں اپنے نامور بھائی کے دست راست بنے رہے، لیکن اپنی شاعری میں انہوں نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا۔ پٹنہ کے کئی برگزیدہ شاعروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی "برگزیدگی" جمیل مظہری کی مرہونِ منت ہے۔ واللہ اعلم۔ ان کے شاگردوں میں لے دے کر ایک احسان دربھنگوی ہیں، جنہوں نے جمیل مظہری کو اپنے اعصاب پر اس حد تک حاوی کر لیا ہے کہ اُن کی الگ شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا کلام ان کا اپنا ہے۔ رضا نقوی واہی کسی زمانے میں علامہ سے بہت قریب تھے۔ ان کے پہلے دو مجموعوں "نقشِ جمیل" اور "فکرِ جمیل" کو مرتب کرنے اور اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنے میں رضا نقوی نے جس جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیا، اس کا اعتراف ہر واقف کار کو ہے۔ "سہیل" گیا کے "جمیل مظہری نمبر" کے لئے مضامین کی فراہمی میں اُن کی کوششوں کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد ایک مرثیے کے تعلق سے جب اختر قادری نے ایک طول طویل بحث چھیڑی، تو رضا نقوی واہی نے اُن کے خلاف ایک ہجویہ نظم بھی لکھی تھی۔ لیکن اچانک ایک ایسا انقلاب آیا کہ علامہ اور واہی ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو گئے۔ واہی نے جمیل مظہری کے خلاف طنزیہ نظمیں بھی لکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ نے کسی سے کہہ دیا تھا کہ واہی کی نظموں کی نوک پلک سنوارنے میں اُن کا بھی حصہ ہے۔ یہیں سے اختلافات کی ابتدا ہوئی۔

جمیل مظہری اپنے انفرادی رنگ کے باعث آسانی سے پہچانے جاتے تھے۔ ایک تخلیقی فن کار کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ اس کی اپنی شناخت ہو۔ لیکن جس طرح اقبال کا رنگِ سخن آج مقبول اور مطبوع نہیں ہے، اسی طرح جمیل کا رنگِ سخن بھی ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ میں نے اُنہیں کو سامنے رکھ کر اُن کی زندگی میں ہی ایک شعر کہا تھا:

اُٹھ گئی ہے دوسروں کی راہ پر چلنے کی رسم
اب وہ اپنے ساتھ اپنا نقش پا لے جائے گا

میں نے عرض کیا ہے کہ جمیل صاحب دوسروں کو اپنا کلام بخشنے میں حاتم تھے۔ وہ برگد کا

ایسا پیڑ تھے، جس کے سائے میں کسی نوجوان شاعر کا پنپنا مشکل تھا۔ جب کوئی نیا شاعر کوئی عمدہ کلام پیش کرتا تو علامہ اس کی جانب سے مشکوک ہو جاتے۔ ترقّی پسند نقطۂ نظر کے حامل نوجوان شاعروں کے قابلِ توجہ کلام کو وہ بہ آسانی پرویز شاہدی سے منسوب کر دیتے۔ جب منظر شہاب کی نظم "ساقی نامہ" مشہور و مقبول ہوئی تو اس پر بھی علامہ نے ایسے ہی شبہے کا اظہار کیا تھا۔

پرویز شاہدی کی شادی ۶ نومبر ۵۵ء کو ہوئی تھی۔ نکاح کی تقریب کے بعد تہنیتی نظموں اور سہروں کا ایک مشاعرہ ہوا۔ جمیلؔ مظہری ایک پختہ مغز اور مشاق شاعر تھے۔ ان کے تخیّل کی بلند پروازی اور فکر کی جولانی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کی نظم پرویز شاہدی سے ان کی دوستی اور رفاقت کی آئینہ دار تھی۔ بہت مقبول ہوئی، بہت سراہی گئی۔ دوسری نظم جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، میری تھی۔ کچھ معتبر شخصیتوں نے، جن میں ل۔ احمد اکبر آبادی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ابراہیم ہوشؔ شامل ہیں، میری نظم کو اپنے کچّے پن کے باوجود علامہ کی نظم پر ترجیح اس لئے دی کہ یہ نظم کسی دوست کی شادی پر صرف مبارک باد پیش کرنے کے لئے نہیں کہی گئی تھی، بلکہ اس میں ایک ترقّی پسند، ظلم و استبداد کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دینے والے شاعر کو اس کی ذمّہ داریوں کا احساس بھی دلایا گیا تھا اور اس لحاظ سے یہ نظم رسمی تہنیتی نظموں سے مختلف تھی۔ علامہ جمیلؔ مظہری نے سرِ بزم اور بزم کے بعد بھی نظم کی بہت تعریف کی، مگر ان کے دل میں ایک کھٹک باقی تھی۔ پرویز صاحب سے انہوں نے ایک شکایت کی: "تم نے ایسی نظم لکھ کر دے دی۔ اگر مجھ سے کہا ہوتا تو میں اسی رنگ کی نظم کہتا۔"

پرویز صاحب نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو مجھے سخت غصّہ آیا۔ لیکن اس وقت پی گیا۔ چند ماہ بعد ایک شام پرویز شاہدی کے گھر پر جمیلؔ مظہری سے میں نے عرض کیا۔ "آپ جانتے ہیں، یہاں وحشتؔ صاحب کا ایک مخالف حلقہ موجود ہے، جو اُن کے بارے میں ایسی ویسی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ وحشتؔ کا پہلا دیوان، جو اُن کی کم عمری میں شائع ہوا تھا، دراصل وحشتؔ کے استاد شمس کلکتوی کا لکھا ہوا ہے۔"

نشانہ ٹھیک جگہ لگا۔ علامہ بہت جز بز ہوئے۔ انہوں نے خفگی بھرے لہجے میں

اس کی پُرزور تردید کی۔ ان کا اندرونی اضطراب ان کے چہرے سے ظاہر تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنے سفلے پن پر خوش ہوا کہ میں نے علامہ سے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔

میں نے علامہ کی تہنیتی نظم "آئینہ" کو بھیج دی، جو ان دنوں "شمع" کے ادارے سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔ ظ۔ انصاری ایڈیٹر تھے۔ علامہ کی نظم حُسن ونفاست کے ساتھ ۲۸ نومبر ۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ کتابت کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ ان کی تصحیح میں نے ۳۰ جنوری ۵۶ء کے شمارے میں چھپوائی۔ میں نے اپنی تہنیتی نظم بھی ساتھ ہی "آئینہ" کو بھیجی تھی۔ مگر وہ شائع نہیں ہوئی۔ علامہ نے کہا۔ "ان لوگوں نے میرے نام کی وجہ سے میری نظم چھاپ دی۔ ورنہ دراصل آپ کی نظم کو پہلی جگہ ملنی چاہیے تھی۔" میں کہہ نہیں سکتا، یہ علامہ کی داد تھی یا ہجوِ ملیح۔

دسمبر ۱۹۵۵ء کے اواخر میں نئے سال کی آمد پر ابراہیم ہوش نے اپنے اخبار "آبشار" کے ذریعے بعض شاعروں کو خطابات تقسیم کئے ــــ جمیل مظہری کو "ہمالیۃ الشعراء"، پرویز شاہدی کو "احمر الملک" اور مجھے "طویل الادب"۔

میں اپنے کلکتہ کے دورانِ قیام میں نوجوان تھا، فعال تھا، معتبر ادیبوں اور شاعروں سے ملنا ملانا میرا شوق، میری دلچسپی تھی۔ ادبی جلسے، نشستیں، مشاعرے۔ ان کا انتظام والنصرام معمولات میں شامل تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہاں میری حیثیت رفتہ رفتہ ادبی پی۔ آر۔ او کی بن گئی تھی۔ کلکتہ کے سب سے ہر دل عزیز اور مقبول شاعر پرویز شاہدی تھے۔ ان سے قربت کے اسباب بیان کر چکا ہوں۔ ل۔ احمد اکبر آبادی کی تحریریں بچپن ہی سے پڑھتا آیا تھا، اور ان کے بارے میں گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کلکتہ میں ہوں گے۔ اتفاق سے "نقوش" میں ان کا ایک خط ۵۲ء میں چھپا، جس میں ان کا کلکتہ کا پتہ درج تھا۔ میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ان کے یہاں پہنچا۔ ل۔ احمد رومانی دور کے بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ ٹامس مور کی مثنوی "لالہ رُخ" کا ایسا ترجمہ کیا تھا کہ باید و شاید۔ اپنے وقت کی مقبول ترین کتاب ہونے کا اُسے اعزاز حاصل تھا۔ ل۔ احمد صاحب میری رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر رہتے تھے۔ میں

پرویز شاہدی اور جمیل مظہری کو ان کے یہاں لے گیا۔ جمیل صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ دو سال پہلے جب جوش صاحب کلکتہ تشریف لائے تھے، تو اس موقع پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میری گزارش پر ل۔ احمد صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں شریک ہوئے۔ یہ کلکتہ کے ادبی حلقے سے اُن کا پہلا تعارف تھا۔ کئی ماہ بعد جمیل صاحب کے اصرار پر وہ "بزمِ احباب" کی نشستوں میں بھی شرکت کرنے لگے۔

جمیل صاحب نے شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ حالاں کہ انہیں جوش صاحب کی قربت بہت میسر تھی۔ جوش نے یوں ہی نہیں کہا تھا:

بحمد اللہ جوش اس بد مذاقی کے زمانے میں
جمیل مظہری سا قدرداں بخشا گیا ہم کو

پرویز شاہدی نے بتایا تھا کہ جمیل صاحب نے ان کے ساتھ دو چار بار بالا خانے کی سیر بھی کی تھی۔ میر محمود طرزی کہا کرتے تھے کہ علامہ ان کے ساتھ کبھی کبھی مس جہاں آرا کجّن کے یہاں جایا کرتے تھے۔ کجّن اپنے وقت کی مشہور طوائف تھی اور بعد میں فلم اسٹار بنی تھی۔ علامہ نے اس کی بابت اشعار بھی کہے تھے، جو آج بھی کچھ دوستوں کے سینوں میں محفوظ ہیں:

وہ پاک وصاف و مطہّر ہے آپ کا آنچل
کہ کل بنے گا شہیدانِ آرزو کا کفن
کچھ اس طرح ہے حیا کا خمیر فطرت میں
کہ مارے شرم کے اُبھرا نہ آج تک جوبن

وہ کجّن کے لئے خود بھی کشش محسوس کرتے تھے، ہجو میں اس جذبے کا اظہار ہو ہی گیا ہے:

رہی کجّن کو ہاتھوں ہاتھ گردش مثلِ پیمانہ
رسیلی آنکھ کا رس پی گئے یارانِ مے خانہ

گھُلی جاتی ہے، پگھلی جاتی ہے، گُل ہوتی جاتی ہے
کرے کیا شمع بے چاری پلا پڑتا ہے پروانہ
مزا ہو صلح ہو جائے اگر دو چار بوسوں میں
لبِ شاعر سے کرلے دوستی رخسارِ جانانہ

جوش ملیح آبادی ترکِ وطن کرنے سے قبل ۵۴ء کے اواخر میں آخری بار کلکتہ آئے۔ ایک مشاعرے کی دعوت پر۔ ایک شام انھوں نے پرویز صاحب کی رہائش گاہ پر گذاری۔ ایک مختصر اور مخصوص محفلِ نا و نوش تھی۔ جوش، جمیل، پرویز، رضا مظہری، آغا حشر کے چھوٹے بھائی آغا نشتر کاشمیری، سالک لکھنوی اور میں۔ شراب کا دَور دیر تک چلتا رہا۔ جمیل مظہری اور رضا مظہری صرف سوڈے پر اکتفا کرتے رہے۔

۵۷ء میں کرشن چندر چند روز کے لئے کلکتہ آئے۔ پہلے تو وہ رُوپ کے شوری کی کسی فلم کے لئے ہوٹل کے ایک کمرے میں مقید ہوکر مکالمے لکھتے رہے۔ اس سے فارغ ہوئے تو ہم لوگوں سے ملنا ہوا۔ دوسرے دن دوبارہ ملنے کا پروگرام طے تھا۔ میں نے پرویز شاہدی کو اطلاع دی۔ پھر ہم ل۔ احمد اکبرآبادی کے یہاں گئے۔ وہاں اتفاق سے جمیل مظہری بھی موجود تھے۔ ہم لوگ میجسٹک ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۳ میں کرشن چندر کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا صبح سے بخار میں مبتلا ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک امریکی رسالہ تھا جس میں نیم برہنہ تصویریں تھیں۔ ہمارا استقبال کرتے ہوئے اُنھوں نے رسالہ پرے رکھ دیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم نے انھیں لیٹ جانے کے لئے مجبور کیا۔ جمیل مظہری سے تعارف ہوا تو کرشن چندر نے کہا: ”میں آپ سے واقف ہوں اور آپ سے پونا میں جوش صاحب کے یہاں مل چکا ہوں۔“ اور پھر تھوڑی دیر تک پونا کی یادیں تازہ ہوتی رہیں۔

کلکتہ میں دسمبر ۵۷ء کی آخری تاریخوں میں ایک آل انڈیا رائٹرس کانفرنس ہوئی۔

ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبد العلیم کا قیام پرکاش نائر (نیر) کے یہاں تھا۔ ملک راج آنند کے ساتھ ان کی نئی نویلی سکریٹری تھیں، جنہیں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبد العلیم SPUTNIK کہا کرتے تھے۔ نائر میرے قریبی شناسا تھے، اس لئے ان ادیبوں کے دوران قیام میرا اُٹھنا بیٹھنا اکثر وہیں ہوتا تھا۔ محفلِ صہبا جمتی۔ ان مہمانوں کے علاوہ کچھ اور معتبر شخصیتیں بھی آجاتیں۔ پرویز شاہدی اکثر، ل۔ احمد اکبر آبادی کم کم۔ بنے بھائی سے میری قربت زیادہ تھی۔ اُنہوں نے ۵۶ء میں مئوناتھ بھنجن کی کل ہند کانفرنس میں بڑی محبت اور شفقت سے مجھے مدعو کیا تھا۔ میں بنے بھائی کو بعض جلسوں میں لے گیا۔ اُن کے ساتھ میوزک کانفرنس میں شرکت کی۔ کچھ شاپنگ کرائی۔ جمیل مظہری سے اسی دوران میری ملاقات ہوئی تو شکایتاً کہنے لگے: "آپ سجاد ظہیر کو لئے لئے پھرے، لیکن میرے یہاں نہیں لائے۔" میں نے ان کی ناگواری دور کرنے کے لئے کوئی بہانہ پیش کردیا، لیکن دل میں سوچتا رہا کہ علامہ تو بڑے بے نیاز سمجھے جاتے ہیں پھر اُنہیں سجاد ظہیر سے ملنے کا اتنا اشتیاق کیوں ہے، اور پھر یہ ان کے دل میں کس "خودی کا سرور" ہے، کہ سجاد ظہیر ہی ان کے یہاں ملنے آئیں، آخر علامہ بھی تو بنے بھائی کی قیام گاہ پر جاسکتے تھے۔

علامہ اپنا کلام شاذ ہی سُناتے تھے۔ چند مخصوص دوستوں کی بات اور ہے۔ ایک بار انہوں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت مجھے یہ سعادت بخشی۔ انہوں نے ۵۵ء میں ایک طویل مسدس (ساٹھ بندوں پر مشتمل) لکھا۔ "فریاد" عنوان تھا۔ مجھے اطلاع کرائی۔ کہنے لگے: "آپ جانتے ہیں میں اپنا کلام سنانے کے معاملے میں بخیل ہوں، لیکن آپ جیسے باذوق نوجوانوں کو بھی یہ نظم سنانا چاہتا ہوں، تاکہ آپ کی رائے جان سکوں۔" پھر جذبے کی پوری شدت کے ساتھ وہ بیس پچیس منٹ تک اپنی نظم سناتے رہے۔ اس کے کچھ ہی ماہ بعد محبوب خزاں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) جاتے ہوئے چند دن کے لئے کلکتہ ٹھہرے۔ اکثر شامیں ان کے ساتھ کسی بڑے ریسٹوراں میں گزرتیں۔ وہ جمیل مظہری کے بڑے مداح اور قدرداں تھے۔ ان کے کلام کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بے شمار اشعار یاد تھے، اور کلام کی ایسی تشریح کرتے کہ

مزہ آجاتا۔ اُنہوں نے علاّمہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو میں انہیں علاّمہ کے پاس لے گیا۔ علاّمہ کو ایسا پڑھا لکھا، ذہین قدرداں کم ہی ملا ہوگا۔ محبوب خزاں نے علاّمہ کو اُن کے ایسے ایسے خوبصورت شعر سنائے کہ اُن کی ساری بے نیازی اور گُم شدگی نیاز اور بیداری میں بدل گئی۔ اس بار بھی انہوں نے اپنی طویل نظم "فریاد" سنائی جو محبوب خزاں کے لئے نئی تھی، اور میرے لئے قند مکرّر۔

اُنہیں دنوں منظر شہاب جمشید پور سے آئے تو ایک شام ہم لوگ علاّمہ کے یہاں پہنچے۔ منظر شہاب ان کے چہیتے شاگرد رہے ہیں۔ کئی سال کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ ابھی صاحب سلامت بھی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ علاّمہ انہیں مخاطب کرکے بولے: "آپ نے میری وہ کتاب اب تک واپس نہیں کی۔"

منظر شہاب سوالیہ نشان بن گئے: "کون سی کتاب؟"

"وہی.... مثنوی.... مثنوی زہر عشق۔"

"میں نے یہ کتاب آپ سے لی ہی نہیں۔" منظر شہاب نے سادگی سے کہا۔

"آپ نے نہیں لی تو کس نے لی۔ آپ کے علاوہ اور کون لے سکتا ہے؟"

"فلاں نے لی تھی۔ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے۔"

"وہ کیسے لے سکتا ہے ــــ وہ 'زہر عشق' کو کیا سمجھے گا؟" علاّمہ کے لہجے میں خفگی تھی۔ شاید یہ مکالمہ ختم نہ ہوتا اگر رضا مظہری صاحب نے بات کا رُخ کسی اور طرف نہ پلٹ دیا ہوتا۔

علاّمہ جمیل مظہری کلکتے میں جب بھی ہوتے "بزم احباب" کی نشستوں میں لازمی طور سے شریک ہوتے اور وہاں اپنا کوئی نہ کوئی تازہ کلام ضرور سُناتے، لیکن مشاعروں سے احتراز کرتے۔ تحت لفظ رُک رُک کر چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کلام پڑھتے اور سننے والا یہ محسوس کرتا کہ وہ ابھی عالم بالا کی طرف پرواز کر جائیں گے۔ میں جن مشاعروں میں ان کے ساتھ شریک رہا ہوں، اُن میں سے چند اب بھی یاد آرہے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کا سالانہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے ہوا تھا۔ مہمانِ خصوصی علامہ جمیل مظہری تھے۔ خان بہادر ابو جعفر کشفی نے صدارت کی تھی۔ میں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبد العلیم کو بھی اس مشاعرے میں لے گیا تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم نے تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ میں مشاعرے کا مخالف نہیں ہوں۔ سجاد ظہیر نے پاکستان جیل کی کچھ یادیں تازہ کیں اور غزل سنائی۔ علامہ جمیل مظہری ان دونوں حضرات کی آمد سے پہلے ہی اپنا کلام سنا کر رخصت ہو چکے تھے۔

۴ جنوری ۱۹۵۸ء کو پٹنہ میں غلام سرور کی کوششوں سے "بہار کا ایک یادگار مشاعرہ" منعقد ہوا۔ غالباً بہار کے اہم ترین شاعروں کی نمائندگی اس حد تک کسی ایک مشاعرے میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر سید محمود نے کیا تھا اور صدارت بیر چند پٹیل نے کی تھی، جو اُس وقت حکومتِ بہار میں وزیرِ صحت تھے، اور اردو شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اس مشاعرے کے انعقاد میں جمیل مظہری کے مشوروں کو کافی دخل تھا۔ اس محفل میں شریک ہونے والے چند خاص شاعر تھے ـــــ مبارک عظیم آبادی، علامہ سریر کابری، محمد مسلم عظیم آبادی، نزار عظیم آبادی، عزیز عظیم آبادی، بدر الدین احمد بدر، رضا نقوی واہی، شاہ قتیل داناپوری، علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، عطا کاکوی، محمود علی خاں صبا، بسمل عظیم آبادی، غضنفر نواب دانش، اسمٰعیل وحشی، یاس بہاری، نصرت آروی ـــ نوجوانوں میں کلیم عاجز، وفا ملک پوری، رمز عظیم آبادی، اکرام شبنم اور مظہر امام۔

دوسرے دن علامہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مشاعرے میں میری کامیابی پر مبارکباد دی۔ اور کہا: "ریڈیو پر تو آپ ہی آپ تھے، دس منٹ تک آپ کی نظم ہوتی رہی۔ میرا ایک شعر دے کر ٹال دیا۔" اس لہجے میں شکایت تھی۔ میں یہاں یہ عرض کردوں کہ اس وقت تک ریڈیو سے میرا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اور نہ مجھے اس کا علم تھا کہ پٹنہ ریڈیو نے اس مشاعرے کے اقتباسات نشر کئے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی بھی اُس وقت تک پٹنہ ریڈیو نہیں پہنچے تھے۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۸ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں رضا علی وحشت کی دوسری

برسی منائی گئی۔ مقالات اور تقریروں کے علاوہ حضرت وحشت کی مدح میں نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ علامہ جمیل مظہری کی نظم اپنے استاد سے غیر معمولی عقیدت کا نہایت فن کارانہ اظہار تھی۔ روزانہ "اخوت" کلکتہ کی رپورٹ کے مطابق:

"اس جلسے میں کلکتہ کی مشہور و معروف ہستیاں جتنی تعداد میں اکٹھا ہو گئی تھیں، شاید ہی کبھی کسی جلسے میں دیکھنے میں آئی ہوں۔ خاں بہادر ابو جعفر کشفی، علامہ جمیل مظہری، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، پروفیسر پرویز شاہدی، جناب ل۔ احمد اکبر آبادی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، جناب مظہر امام، جناب سالک لکھنوی، پروفیسر اختر حسن اور دیگر اہم شخصیتیں جلسے میں موجود تھیں۔"

۴ اکتوبر ۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں ایک کل ہند مشاعرے کا دو روزہ سیشن پارک سرکس میدان میں شروع ہوا۔ صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی، اور افتتاح مہر چند کھنہ نے جو اس وقت حکومتِ ہند میں وزیر بحالیات تھے۔ اس مشاعرے کے لئے جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، بخشی غلام محمد، مولانا حفظ الرحمٰن نے خصوصی پیغامات بھیجے تھے۔ علامہ جمیل مظہری، اعجاز صدیقی اور روش صدیقی نے مولانا آزاد مرحوم کے حضور اپنا منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ باہر سے آنے والے دیگر شاعروں میں معین احسن جذبی، وامق جون پوری اور نشور واحدی کے نام ذہن میں آرہے ہیں۔

یکم مارچ ۵۹ء کو کلکتے میں ایک کل ہند اردو کانفرنس ہوئی اور ساتھ ہی ایک انڈو پاک مشاعرہ۔ انڈو پاک مشاعرے کے نام کی لاج اس وقت کے مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے عندلیب شادانی، سرور بارہ بنکوی اور اقبال عظیم نے رکھ لی تھی۔ صدر تھے — آلِ احمد سرور۔ ہندوستان کے دیگر شاعروں میں علامہ جمیل مظہری، روش صدیقی، رضا نقوی واہی، حبیب تنویر، کلیم عاجز اور وفا ملک پوری کے علاوہ کئی "مشاعرہ باز" شاعر تھے۔ پرویز شاہدی اپنے بعض اختلافات کی بنا پر اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ میں کٹک سے آیا تھا اور مشاعرے کی

نظامت کے فرائض میں نے ہی انجام دیئے تھے۔

علامہ جمیل مظہری کلکتہ اور پٹنہ کے خاص مشاعروں میں کبھی کبھی مروتاً شریک ہوجاتے تھے۔ لیکن کافی تکلف کے ساتھ۔ باہر کے مشاعروں کے لئے دعوت بہت آتی، لیکن وہ کبھی قبول نہ کرتے۔ دور کا سفر کرنے سے طبیعت میں انقباضی کیفیت پیدا ہوتی۔ مشاعروں کا مجمع دیکھ کر گھبرا جاتے۔ میں ۶۳ئ میں کٹک سے تبدیل ہو کر گوہاٹی پہنچا تو وہاں حکومت آسام کے وزیر مالیات فخرالدین علی احمد تھے۔ اُن کی بہن حمیدہ سلطان اُن کے یہاں شیلانگ آئیں۔ مشورہ ہوا کہ آسام میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی جائے اور ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ دیوکانت بروا' اس وقت آسام کے وزیر تعلیم تھے۔ وہ انجمن کے صدر بنے۔ مسز عابدہ احمد نائب صدر' میں سکریٹری مقرر ہوا۔ ۱۱ اور ۱۲ اگست کو گوہاٹی اور شیلانگ میں بڑے اہتمام سے دو مشاعرے ہوئے۔ گوہاٹی کے مشاعرے کی صدارت فخرالدین علی احمد نے کی۔ اور شیلانگ کے مشاعرے کی وشنو سہائے گورنر نے۔ باہر سے روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد، اویس احمد دوراں اور وفا ملک پوری آئے تھے۔ جمیل مظہری اصرار کے باوجود تشریف نہیں لائے۔ لیکن انہوں نے ایک نہایت خوب صورت نظم بہ عنوان "اردو" بھجوادی تھی، جو دونوں مشاعروں میں پڑھی گئی اور بہت پسند کی گئی۔

مجھے اس وقت لال قلعہ کے ایک مشاعرے کی یاد آرہی ہے، جو "دیوانِ عام" میں ۷، نومبر ۶۲ئ کو بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کا افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا۔ کسی اردو مشاعرے میں یہ نہرو کی آخری شرکت تھی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے تقریباً تمام سرکردہ شعراء شریک تھے۔ کچھ نام اس وقت ذہن میں آرہے ہیں:۔۔ فراق گورکھپوری' جمیل مظہری، آنند نرائن ملا، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، ساغر نظامی، آلِ احمد سرور، علی جواد زیدی، سکندر علی وجد، شعری بھوپالی، گوپی ناتھ امن، پرویز شاہدی، سلام مچھلی شہری، غلام ربانی تاباں، جگن ناتھ آزاد، شمیم کرہانی، راہی معصوم رضا، نشور واحدی، غلام رسول نازکی، فرقت کاکوروی، دلاور فگار۔ اپنا نام "سرکردہ شاعروں" کی فہرست میں شامل کرنا آداب انکساری کے خلاف ہے۔ تاہم یہ عرض کرنے میں کوئی قباحت نہیں کہ مجھے بھی گوہاٹی سے اس مشاعرے کے لئے

مدعو کیا گیا تھا۔ علامہ جمیلؔ مظہری نے جس کرب کے ساتھ اپنا کلام سُنایا تھا، وہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس مشاعرے کے دو روز بعد حمیدہ سلطان کے یہاں پنڈت دتاتریہ کیفی کی یاد میں ایک مخصوص نشست ہوئی۔ اس میں جمیلؔ مظہری، پرویز شاہدی، روشؔ صدیقی، شعری بھوپالی، دلاور فگار اور میں نے کلام سُنایا۔ فخرالدین علی احمد اور دیوکانت بروا بھی اُن دنوں آسام سے آئے ہوئے تھے۔ اور اس محفل میں شریک تھے۔

۵۷ء کے اواخر میں "سہیل" گیا کے مدیر ادریس سُنہاروی کلکتہ تشریف لائے، تو پرویز شاہدی کی خواہش اور مشورے پر طے ہوا کہ "سہیل" کا پرویز شاہدی نمبر شائع کیا جائے اور اسے میں ترتیب دوں۔ ادریس سُنہاروی واپس بہار آئے تو کچھ لوگوں نے جن میں گیا اور جمشید پور کے ایک دو حضرات بھی شامل تھے، اور جو پرویز شاہدی سے کسی بنا پر پرخاش رکھتے تھے، ادریس صاحب کو شیشے میں اُتارا کہ علامہ جمیل مظہری جیسے عظیم المرتبت شاعر کا خاص نمبر پہلے شائع ہونا چاہئے۔ پرویز شاہدی کا نمبر بعد میں آسکتا ہے۔ پرویز صاحب کو اس کا علم ہوا تو فطری طور پر یہ بات اُنہیں بہت ناگوار ہوئی اور انہوں نے ادریس صاحب کو اطلاع دے دی کہ اب وہ اپنے خاص نمبر کے سلسلے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ ادریس صاحب اپنی جگہ بے موقعگی محسوس کر رہے تھے، لیکن وہ جن لوگوں کے حلقۂ اثر میں تھے، انہیں ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے پرویز صاحب کی خفگی اور دُکھ کا اندازہ تھا۔ "سہیل" کے ادارے میں میرا نام بھی تھا، اس لئے میں کچھ اور پریشان تھا۔ بالآخر میں نے یہ تجویز رکھی کہ "جمیلؔ مظہری نمبر" اور "پرویز شاہدی نمبر" ساتھ ساتھ شائع کئے جائیں۔ پرویز صاحب دل برداشتہ تھے، لیکن میں نے انہیں کسی طرح راضی کر لیا۔ دونوں نمبروں کی ترتیب کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔ فروری ۵۸ء کے "سہیل" کے اداریہ میں یہ اعلان کیا گیا:

"علیحدگی ——— ایک مقصد کے تحت"

"سہیل" کے مجوزہ "جمیلؔ مظہری نمبر" اور "پرویز شاہدی نمبر" کی ترتیب

کی ساری ذمہ داری ہم نے جناب مظہر امام کے سپرد کردی ہے، اس لئے ان کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ آئندہ سے ان کا نام ادارہ میں شامل نہ ہوگا تاکہ ان پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور وہ ان خاص نمبروں کا کام پوری توجہ اور دل جمعی سے کرسکیں۔"

دونوں نمبروں کا اعلان "سہیل" میں کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا۔ "جمیل مظہری نمبر" کا اعلان یوں تھا:

اُردو میں فلسفیانہ اور فکری شاعری کے سب سے اہم نقیب

علاّمہ جمیلؔ مظہری

کی شخصیت اور شاعری کے متعلق ملک کے صاحب رائے، مستند اور مقتدر نقادوں اور ادیبوں کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ

جمیلؔ مظہری نمبر

جو اُردو ادب میں مُردہ پرستی کے خلاف ایک زندہ اور روشن روایت کی بنیاد ڈالے گا۔ اس ضخیم نمبر میں شاعر کے بہترین مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب بھی پیش کیا جائے گا۔

ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ

ایک ادبی صحیفہ

جسے اُردو کی نئی پود کے مشہور شاعر مظہر امام ترتیب دے رہے ہیں۔

اس نمبر کے لئے کئی اہم مضمون نگاروں نے میری دعوتِ نگارش قبول کرلی تھی، جن میں سے چند کے نام ہیں ـــ نیازؔ فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ل۔ احمد اکبرآبادی، اخترؔ اورینوی، آلِ احمد سرور، احتشام حسین، نجیب اشرف ندوی، مختار الدین آرزو، عبادت بریلوی، عندلیب شادانی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، سہیل عظیم آبادی، سعید احمد اکبرآبادی، ارشد کاکوی، محبوب خزاں وغیرہ، لیکن پھر "سہیل" کی جانب سے سرد مہری کا اظہار ہوا اور کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ میں کلکتے میں تھا

اور بہار کی ادبی سیاست سے بالکل ناواقف تھا۔ "جمیل مظہری نمبر" تین سال بعد شائع ضرور ہوا، لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۵۸ء میں میری شادی ہوئی تو بعض دوستوں نے تہنیتی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہا۔ میں نے علامہ سے بھی ایک نظم کی فرمائش کی۔ انہوں نے دو تین دن کے اندر ہی اکتالیس[۴۱] اشعار کی ایک نظم لکھ کر دے دی۔ اس کے ایک مصرعے سے شادی کی تاریخ بھی نکلتی تھی:

آ، دُلہن بیاہ لائے مظہر امام

۱۳۷۷ھ

اس نظم کے دو ابتدائی شعر یہ تھے:

ایک شاعر کی زندگی، کل تک — تھی کم و بیش ایک خالی جام
واعظانہ تھا شاعری کا مزاج — زاہدانہ تھا زندگی کا نظام

شاید ترقی پسندی سے میرے پرانے تعلق کی بنا پر علامہ نے میرے شعری مزاج کو "واعظانہ" کہا تھا۔ البتہ میری زندگی کے نظام کو "زاہدانہ" قرار دینے کا سبب کیا تھا، یہ میں نہیں جان سکا۔ بہر حال، یہ سند میرے حق میں کار آمد تھی۔

میری نظم "کنگال آدرش" شائع ہوئی تو میں گوہاٹی میں تھا۔ اس نظم میں یہ لائنیں بھی تھیں:

یہ محبت کی بنجر زمیں
جہاں پھول کھلتے نہیں
جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں
یہ محبت
جو چولھے سے بستر کی بھدّی شکن تک ہی محدود ہے
یہ محبت نہیں

جبر ہے

خود غرض مادرانہ محبت ہے یہ

جمیل مظہری نے خفا ہو کر پٹنہ سے مجھے ایک خط لکھا، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اب آپ اتنے جدید ہو گئے ہیں کہ ماں کی محبت کو خود غرض محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ جو خدا اور رسول سے گستاخی کرنے کی جرأت کر سکتے تھے، ایک عام ہندوستانی کی طرح ان کے لئے یہ تصور کرنا محال تھا کہ ماں کی محبت میں خود غرضی کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔

اس سے ملتا جلتا مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے، جس کا تعلق علامہ کے دوست سے ہے۔ ۶۵ء میں جب مجھے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو گرتا پڑتا گوہاٹی سے دربھنگے پہنچا۔ والدہ کے انتقال کو چار پانچ دن ہو چکے تھے کہ اجتبیٰ رضوی تعزیت کو آگئے۔ اس معذرت کے ساتھ کہ انہیں اس سانحے کی اطلاع اسی دن ملی ہے۔ میں نے اپنے یہاں کی افسردہ فضا کی شدت کو کم کرنے کی غرض سے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ اجتبیٰ رضوی نے میری والدہ کی علالت کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا تو میں نے مختصر جواب دے کر بات کا رُخ بدل دیا۔ اجتبیٰ صاحب نے شاید یہ محسوس کیا کہ میں نے اتنے بڑے حادثے کا خاطر خواہ اثر نہیں لیا ہے۔ انہوں نے ماں کی عظمت، شفقت، اس کی قربانیوں اور سخت کوشیوں پر ایک طویل، رقت آمیز تقریر کی اور میرے دل کو عزا خانہ بنا کر رخصت ہوئے۔

دربھنگے کے ذکر پر خیال آیا کہ ایک بار ۶۴ء میں جب میری بچّی کی ولادت ہوئی تھی، علامہ جمیل مظہری میرے گھر "امیر منزل" تشریف لائے تھے ـــ مبارک باد دینے یا یوں کہیے میری مسرت میں شریک ہونے۔ وہ ان دنوں اپنے عزیز ڈاکٹر سید صفدر علی خاں کے یہاں، جو اُن دنوں دربھنگہ میڈیکل کالج میں سپرنٹنڈنٹ تھے، آئے ہوئے تھے۔

جمیل صاحب کلاسیکی ادب کا رچا ہوا شعور رکھتے تھے اور ان کا شعری ذوق انتہائی لطیف تھا۔ دورانِ گفتگو صفی کے مشہور مطلع :

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے : "یہ مطلع اتنا مشہور ہو گیا کہ اس غزل کے ایک بہت عمدہ شعر کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔" اور پھر اُنھوں نے ایک عالم جذب میں یہ شعر پڑھا :

ذرا جاگتے رہیو اے ہم صفیرو!
ہم آواز دیں، تم بھی آواز دینا

مجھے یاد آیا، ایک بار پرویز صاحب کے سامنے داغ کے سلسلے میں گفتگو چل نکلی پرویز شاہدی کے نزدیک داغ انحطاطی دور کے ایک معمولی شاعر تھے، اور ان کے یہاں کوئی ایسا شعر نہیں جو درخورِ اعتنا ہو۔ جمیل مظہری نے جنہیں عام طور پر غالب اور اقبال کے قبیلے کا شاعر سمجھا جاتا ہے، داغ کے ایسے ایسے خوبصورت شعر سنائے کہ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ پرویز صاحب پھر بھی قائل نہیں ہوئے۔ علامہ نے میری طرف اشارہ کرکے پرویز صاحب سے کہا : "ان کا شعری ذوق تم سے بہتر ہے۔ تم تو نرے ترقی پسند ہو۔"

جب میں گوہاٹی سے تبدیل ہو کر ۶۷ء میں پٹنہ آیا تو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو میں سہیل عظیم آبادی اُردو پروگرام کے پروڈیوسر تھے۔ پروگرام ایگزیکٹو کی حیثیت سے مجھے بھی اسی شعبے کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ جمیل مظہری پٹنہ یونی ورسٹی سے ریٹائر ہو چکے تھے اور اب یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کے وظیفے پر ایم۔ اے کے طلبار کو کبھی کبھی لیکچر دیا کرتے تھے۔ افضل پور میں ریٹائرڈ جج علی جواد مرحوم کے مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تنہا رہا کرتے۔ گرمیوں میں بھی سوئٹر جسم سے چپکی رہتی، سردیوں میں شاید ہی کبھی غسل کرتے۔ کمرہ بے ترتیب۔ ڈھیلی چارپائی پر، گندی میلی توشک، جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی۔ بستر کی چادر جیسے برسوں سے نہ بدلی گئی ہو۔ مڑے تڑے کاغذ کے ٹکڑوں پر کلام توشک کے نیچے پڑا رہتا، لیکن شعر کہتے تو ایسے :

بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانۂ حال
رُکا تو وقت کی رفتار روک دی میں نے

مجھے ان کی شخصیت کا یہ تضاد بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

گوہاٹی میں یہ شعر کہا تھا :

کیا گلستاں کو نکھاریں گے نقیبانِ بہار

اپنے کمرے میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے

تو میں عرض کر رہا تھا، اپنے پٹنہ آنے کے سلسلے میں۔ سہیل عظیم آبادی ہمیشہ جمیل مظہری سے چھوٹے بھائی کی طرح ملا کرتے اور انہیں "بھیا" کہہ کر مخاطب کرتے۔ سہیل بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ جمیل صاحب پروگراموں کے کنٹریکٹ گم کر دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ڈاک سے کنٹریکٹ بھجوانے کی بجائے، وہ خود جا کر جمیل صاحب سے دستخط لے لیتے ہیں۔ سہیل بھائی برابر یہ کارِ خیر انجام دیتے رہے۔ لیکن جب میری آمد کے کوئی دو سال بعد وہ ریٹائر ہوئے تو یہ ناز برداری میرے حصے میں آئی۔ اس "فرضِ منصبی" کے علاوہ بھی میں اکثر جمیل مظہری کی خدمت میں باریاب ہوتا۔ ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ یکساں ہوتی۔ ان کی گم گشتگی کے قصے بہت مشہور ہیں۔ لیکن مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں آ رہا ہے، جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور انہوں نے کسی طرح کی بے نیازی یا بے التفاتی کا مظاہرہ کیا ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ باتیں کرتے کرتے کچھ لمحوں کے لئے کھو گئے ہوں، لیکن میری آمد اور رخصت کے وقت وہ ہمیشہ باہوش دکھائی دیتے۔ اس زمانے کا کچھ غیر مطبوعہ کلام اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ پٹنہ ریڈیو سے اس دوران انہوں نے جو مضامین نشر کئے، ان کے مسودے میں نے خدا بخش لائبریری میں محفوظ کرا دیئے تھے۔

اس زمانے کی ایک دو باتیں اور یاد آ رہی ہیں۔ ۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے موقع پر عطا کاکوی صاحب کی غزلوں کا مجموعہ "نذرِ غالب" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اس کی ایک کاپی مجھے مرحمت فرمائی۔ علامہ جمیل مظہری بھی اس وقت میری رہائش گاہ پر موجود تھے۔ انہوں نے اس کتاب کی پشت پر ایک قطعہ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا :

مر گیا گرچہ غالبِ دانا　　آج مظہر امام زندہ ہے

ہے وہ زندہ تو بعد غالب کے　　اب بھی اس کا پیام زندہ ہے

۱۹۷۲ء میں جب میرے چھوٹے بھائی سید منظر امام نے جمشید پور سے ایک سہ ماہی جریدہ "ترسیل" نکالنے کا ارادہ کیا تو ہم دونوں علامہ کے پاس ان کی تخلیق حاصل کرنے گئے۔ جب وہ مجوزہ رسالے کے معیار وغیرہ کے بارے میں مطمئن ہو گئے تو انہوں نے تازہ مثنوی "جہنم سے" اس میں شائع کرنے کے لئے عنایت کی۔ اس مثنوی کو بعد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی، اور اب تک کہیں اور نہیں چھپی ہے۔ اس مثنوی کا عنوان علامہ نے "از جہنم" رکھا تھا۔ میں نے ان کی اجازت کے بغیر اس کا عنوان بدل کر "جہنم سے" کر دیا۔ جب میں مطبوعہ رسالہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اندیشہ تھا کہ وہ خفا ہوں گے، لیکن اُلٹے انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

جمیل صاحب کو کھانے سے زیادہ کھلانے کا شوق تھا۔ وہ اکثر نہاری کی دعوت دیتے۔ اس کے لئے مجھے صبح سویرے جاگنا پڑتا۔ باقر گنج سے، جہاں میں رہتا تھا افضل پور کا فاصلہ رکشے سے اندازاً بیس پچیس منٹ میں طے ہوتا تھا۔ شکر ہے کہ اُن کی بار بار دعوت کے باوجود میں سحر خیزی کی عادت سے محفوظ رہا۔ جمیل صاحب بڑے چاؤ اور بڑی محبت سے کھلاتے۔ اپنے جھوٹے ہاتھ سے گوشت کے عمدہ ٹکڑے کا انتخاب کرتے اور میری پلیٹ میں ڈالتے۔ میں ان کی اس عادت کے بارے میں کئی داستانیں سُن چکا تھا۔ شروع شروع میں تو کراہت ہوئی، لیکن جی کڑا کر کے اُسے گوارا کرنا پڑا۔ ارادت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

جمیل صاحب کی بار بار دعوتیں کھا کھا کر مجھے غیرت آئی تو ایک بار میں نے بھی انہیں دن کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ انہوں نے یہ شرط رکھی کہ وہ سرسوں کے تیل میں بنا ہوا خشکہ کھائیں گے۔ کیوں کہ جب سے انہیں دل کا عارضہ ہوا ہے، ان کے لئے ہر کھانا سرسوں کے تیل میں بنتا ہے۔ میں خود ان کے یہاں اس طرح کے کھانے کا مزہ لے چکا تھا۔ ان کی شرط پوری کی گئی۔ کھانے پر سہیل عظیم آبادی اور مناظر عاشق ہرگانوی بھی موجود تھے۔ باتوں اور لطیفوں میں جمیل صاحب کو اس بات کا موقع نہ مل سکا کہ وہ گوشت کے

پیالے میں اپنے جھوٹے ہاتھ ڈال کر عمدہ بوٹیوں کا انتخاب کر کے ہماری پلیٹوں میں منتقل کر سکیں۔ سہیل بھائی نے میری جانب کنکھیوں سے دیکھا۔ مسکرائے اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔

میں ۱۹۷۴ء میں سخت بیمار ہوا۔ ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، یونانی اور آیورویدک دواؤں سے عاجز آ کر میں مظفر پور کے NATURE - CURE CLINIC (فطری علاج کے شفا خانے) میں داخل ہو گیا تھا۔ وہاں اُبلی پھیکی سبزی کھانی پڑتی۔ آٹھ دن اور آٹھ رات مسلسل فاقہ کشی کرنی پڑی۔ میں اپنا چودہ کلو وزن کھو چکا تھا اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ میرا حال سُن کر میری بیوی پٹنے سے مظفر پور آ گئیں۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے کے پاس ایک رکشا آ کر رُکا اور اُس میں سے جمیل مظہری نمودار ہوئے۔ میں انہیں اس جگہ غیر متوقع طور پر دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کے یہاں بھیکن پور آئے ہوئے تھے۔ میرے بارے میں پٹنہ میں معلوم ہوا تھا اور وہ پوچھتے پوچھتے یہاں آ گئے تھے۔ بھیکن پور سے مظفر پور کا فاصلہ کم از کم سات میل ہے۔ یہ پیرانہ سالی اور یہ اظہارِ خلوص۔ میری بیوی سے یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ کہنے لگے: "آپ نے انہیں اس 'غیر فطری علاج' کے لئے کیوں آنے دیا؟" میری بیوی نے کہا: "آپ ہی انہیں سمجھائیے۔ میری تو سنتے نہیں۔"

جمیل مظہری دوسروں کی خوشی اور غم دونوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ وضع داری آج کی تیز رفتار زندگی میں معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ کہتے تھے:

اے گم شدگی! اے بے نیازی! تیرا نام جمیل مظہری ہے

ایسے پراگندہ طبع لوگ اب کہاں ہیں۔ کاش ایسی گم گشتگی اور بے نیازی ہر ایک کو میسر ہو، جو دوسروں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھے، جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی محرومیوں کا سایہ نہ پڑنے دے۔ جمیل مظہری کے کپڑے میلے کچیلے رہتے ہوں، مگر ان کی روح صاف و شفاف تھی۔ میں نے کسی کمزور لمحے میں تعلّی کا ایک شعر کہا تھا۔

سچائی یہ ہے کہ یہ شعر جمیلؔ مظہری کی جانب سے ہونا چاہئے تھا :

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

"عصرِ نو" کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میں نے جمیلؔ مظہری کو حسبِ توفیق نگاہوں میں چھپا کر رکھ لیا ہے!

● ۱۹۸۲ء

پرویز شاہدی

جیسے جیسے وقت کا رہوار آگے بڑھتا جاتا ہے، یادوں کی لویں مدّھم اور مدّھم ہوتی جاتی ہیں۔ پرویز شاہدی کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات کم و بیش دس سال پر محیط ہیں۔ سوچتا ہوں اُن کی شخصیت کی بوقلمونی کا کون سا نقش اُجاگر کروں اور کس طرح کروں:

بہت سے نقش دُھندلے ہو گئے ہیں!

اب سے تقریباً ۳۵ سال پہلے کی بات ہے۔ میں کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ انہیں دنوں ایک روز پروفیسر اختر قادری نے کلاس میں یہ شعر سُنایا تھا:

جوانی اور غُربت کی جوانی، ہائے کیا کہنا
کسی نے رکھ دیا پگھلا کے سونا چشمِ سائل میں

نہ جانے اس شعر میں کون سا اثر تھا کہ میرے حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ گیا۔ کسی نے بتایا یہ شعر جمیل مظہری کا ہے۔ اُس وقت تک جمیل مظہری بہار میں ایک Legend کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، اور ہر اچھّا شعر اُن سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔

اس کے قریباً آٹھ نو سال بعد جب مجھے پرویز شاہدی نے طول طویل ہم نشینی

کی عزت بخشی تو وہ اکثر اپنا نیا پرانا کلام سنایا کرتے۔ عموماً ترنم کے ساتھ، کبھی درخواست پر، اور کبھی درخواست کے بغیر بھی۔ اُنھی دنوں پرویز صاحب نے اپنی ایک پرانی غزل سنائی اور جب وہ اس شعر پر پہنچے تو میں چونکا۔ تو یہ شعر جمیل مظہری کا نہیں، پرویز شاہدی کا تھا۔ انہوں نے بتایا یہ غزل ۳۸ئہ میں کلکتہ کے ایک خاص مشاعرے میں پڑھی گئی تھی، اور بہت کامیاب رہی تھی۔ پرویز شاہدی کے ایک شعر سے تعارف بھی ہوا تو کس طرح! "رقصِ حیات" کی ترتیب کے وقت وہ اس غزل کو شامل کرنے کے حق میں نہ تھے۔ میرے اصرار پر محض اس شعر کی بنا پر یہ غزل مجموعے میں جگہ پا سکی۔

میں نے پرویز شاہدی کا نام اس شعر کے تقریباً سال دو سال بعد سُنا اور وہ بھی اس طرح کہ ——— "خوب پڑھتے ہیں اور خوب پیتے ہیں"۔ میں اپنے وطن دربھنگے میں تھا، اور عمر کی ایسی منزل میں، جب ہر سچی جھوٹی بات دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ سُنتا تھا کہ وہ شعراء جو ترنم کے جادو جگاتے ہیں، اُن کے سالارِ کارواں جگر مرادآبادی ہیں۔ حفیظ اور ساغر کے ترنم کے بھی چرچے تھے۔ مجھے خود اُن شعراء کو اُس وقت تک کبھی دیکھنے یا سُننے کا موقع نہ ملا تھا۔ پرویز صاحب کا تعارف بھی ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ہوا، جس کا شناختی نشان تھا اُس کا ترنم اور اُس کی بدمستی!

پرویز شاہدی چھپنے چھپانے کے بہت قائل نہ تھے۔ ان کا کلام شاذ ہی کسی رسالے میں نظر آتا تھا۔ تمنائی نے ۴۴ئہ میں بہار کے شاعروں کا ایک مجموعہ "اشارہ" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس میں ان کی دو نظمیں شامل تھیں۔ کلکتہ کے اخبارات اور غیر معروف رسائل میں اُن کا کلام کبھی کبھی چھپتا رہا ہوگا، لیکن ان کی رسائی مجھ تک نہیں تھی۔ کلکتہ کے بعض دوست مثلاً نشاط الایمان کبھی کبھی پرویز شاہدی کی خیریت کی خبر دیتے ——— "بہت اچھا لکھ رہے ہیں، کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن ہیں .... اِن دنوں جیل میں ہیں۔ ...... جیل سے اُن کا لکھا ہوا ایک خط 'آزاد ہند' میں چھپا ہے، اور ایک نئی نظم 'تضاد' بھی ......" وغیرہ وغیرہ۔ میں ۴۷-۴۶ئہ سے ہی ترقی پسند ادبی تحریک سے

وابستہ اور اشتراکیت کا قتیل تھا۔ اس لئے پرویز صاحب سے دلچسپی تو تھی، لیکن اُن کی شاعری کے بارے میں اَب تک کوئی واضح تصوّر قائم نہ کر سکا تھا۔

سنہ ۵۱ء کے وسط میں بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کی جانب سے پٹنہ میں کُل بہار اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں اُردو ادب کی کئی بڑی اہم شخصیتیں شریک ہوئیں۔ غلام سرور کرتا دھرتا تھے۔ اختر اورینوی، عبدالقیوم انصاری، سہیل عظیم آبادی وغیرہ پیش پیش دکھائی دیئے۔ باہر سے رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم مجاز، جذبی وغیرہ تشریف لائے تھے۔ کلکتے سے پرویز شاہدی۔ پرویز صاحب کو پہلی بار سنا۔ انہوں نے اپنی نظم "تضاد" سُنائی تھی۔ اُن کا ترنم دوسروں سے مختلف تھا۔ اس میں ایک ایسی انفرادیت تھی، جسے ہم "پرویزیت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ مشاعروں کی عام نغمہ سرائی نہیں تھی، اس لئے ممکن ہے پرویز صاحب کا "غیر نسائی" ترنم کچھ لوگوں کو اجنبی سا لگا ہو۔

میں نے ستمبر سنہ ۵۱ء میں بی۔ اے کیا اور حصولِ معاش کے لئے کلکتہ آ گیا۔ وہاں سے اُن دنوں ایک روزانہ اخبار "کارواں" شائع ہوتا تھا، جس کے مالک محمد یونس نظری تھے چند سال پہلے وہ ایک ہفتہ وار "نقاش" نکالا کرتے تھے، جس میں میری ابتدائی چیزیں چھپی تھیں۔ شین مظفر پوری بھی "نقاش" کی ادارت سے وابستہ رہ چکے تھے اور ان دنوں "روزانہ ہند" کے نیوز ایڈیٹر تھے۔ اُن ہی کی تائید پر نظری صاحب نے، جو مجھ سے بھی اچھی طرح واقف تھے، "کارواں" کے لئے مجھے دربھنگے سے بُلوایا تھا۔ میں نے نیوز ایڈیٹر کی حیثیت بہ مشکل ایک ماہ کام کیا ہوگا کہ یہ اخبار بند ہو گیا، اور میں بے روزگار۔ شین مظفر پوری نے "روزانہ ہند" میں مجھے جگہ دلانے کی کوشش کی، لیکن روزگار کی دوڑ میں ایک اور صاحب مجھ سے آگے نکل گئے۔ میں قریباً دو ماہ بالکل بے کار رہا۔ ایک آدھ ٹیوشن پر گذارا تھا، جس سے دس روپے ماہوار ملتے تھے۔ بڑی عسرت اور تنگدستی کے دن تھے، لیکن ع کھلتا کسی پہ کیوں مرے غم کا معاملہ!—

میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شریک ہونے لگا تھا۔ پرویز شاہدی سے وہیں سرسری تعارف ہوا۔ میں نے پٹنہ کی کانفرنس اور مشاعرے کا ذکر کیا۔ بعض محفلوں میں اپنی موجودگی

کا حوالہ بھی دیا۔ پرویز صاحب کو یقیناً یاد نہیں تھا، لیکن انھوں نے ایسا ظاہر کیا کہ انھیں سب یاد ہے اور وہ مجھ سے مل چکے ہیں وغیرہ۔ مختصراً یہ کہ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں کوئی کمتر شخصیت نہیں ہوں۔ یہ پرویز صاحب کی شخصیت کی بڑائی اور سحر کاری کا پہلا نقش تھا۔

اُن دنوں پرویز شاہدی انجمن بوائز اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہ کبھی انجمن مفید الاسلام ہائی اسکول تھا، لیکن اب اس میں آٹھویں درجے تک پڑھائی ہوتی تھی۔ اسکول کا حال خستہ تھا۔ تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ پرویز صاحب کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے مقرر تھی، لیکن سو روپے بھی مشکل سے مل پاتے تھے، اور وہ بھی قسطوں میں، تقاضوں کے بعد۔ اسی اسکول میں انور عظیم ساٹھ روپے ماہوار پر کام کر رہے تھے۔ میں نے یکم اکتوبر سے "کارواں" میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی تھی، لیکن نظری صاحب سے بہ مشکل ۲۵ روپے وصول ہو سکے اور وہ بھی پانچ پانچ روپے کی سات قسطوں میں۔ شاید اکتوبر ہی کے اواخر میں غلام ربانی تاباں کسی سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے تھے۔ غالباً وہ ان دنوں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر تھے۔ انور عظیم ان کے ساتھ ہی جامعہ میں اُستاد ہو کر ہمیشہ کے لئے دہلی چلے گئے۔ میں بے کار ہوا تو پرویز صاحب سے ملا اور ان سے انور عظیم والی جگہ کے سلسلے میں بات کی۔ انہوں نے کہا کہ نومبر دسمبر میں بحالی نہیں ہوگی، کیونکہ سال ختم ہو رہا ہے اور فنڈ کی کمی ہے۔

۲ جنوری ۵۲ء کو جب اسکول کا نیا سال شروع ہوا تو پرویز صاحب نے مجھے اپنے اسکول میں بلوالیا۔ وہاں میں نے پندرہ دن ہی کام کیا ہوگا کہ مجھے سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول میں جگہ مل گئی۔ وہاں تنخواہ پچھتر روپے تھی، اور یہ اسکول میری رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ پرویز صاحب کی خواہش نہ تھی کہ میں ان کا اسکول چھوڑ کر کسی اور جگہ جاؤں، لیکن میں نے اپنی مجبوریاں بتائیں تو وہ راضی ہو گئے۔

انجمن اسکول میں پرویز صاحب سے تفصیلی گفتگو کرنے، ان کے ماضی کے حالات جاننے اور اُن کی شاعرانہ خصوصیات سے واقف ہونے کا تھوڑا بہت موقع ملا۔ ایک بات

میرے ذہن میں چپکی ہوئی تھی کہ وہ بلانوش اور رومان پرست ہیں۔ لہذا جب اسکول سے رخصت ہو کر ہم دونوں الگ الگ راستے اختیار کرتے تو میں یہ سوچتا کہ وہ ضرور کسی لالہ رُخ کے کاشانے کی طرف جارہے ہوں گے اور سورج غروب ہوتے ہی چراغِ بادہ روشن کریں گے۔

یاروں نے یہ بھی اڑا رکھا تھا کہ پرویز صاحب بوتل سرہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ ان کے معاشقوں کی متعدد داستانیں دوستوں نے سُنا رکھی تھیں۔ مدنا پور کے قیام کے دوران اُن کے "معاشقے"، پھر کلکتہ کے کچھ تازہ "مراحلِ شوق"۔ یار لوگ کچھ نام بھی اُن سے منسوب کرتے ــــ مثلاً اُرسلا کوہن، یہودی خاتون، جو ترقی پسند مارکسٹ ماہنامہ "UNITY" کے اڈیٹر David Cohen کی بہن یا کوئی قریبی عزیز تھیں۔ اور شیبانی ڈے کمیونسٹ کارکن بنگالی لڑکی۔ کچھ "احباب" جو پرویز صاحب سے قربت کا دعویٰ کرتے تھے اور شاید سچ ہی کرتے تھے، بعض واقعات پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرتے۔ میں اسے کردارکُشی تو نہیں کہوں گا، لیکن یہ ضرور ہے کہ ان جزئیات سے پرویز صاحب کی بعض کمزوریاں فربہ اندام نظر آتی تھیں۔ میں آج بھی جب سوچتا ہوں تو اُلجھن ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے حلقۂ احباب یا حلقۂ ارادت میں کیسے کیسے لوگوں کو شامل کر رکھا تھا۔ پرویز صاحب طبعاً معصوم تھے، اور ہر شخص جو اُن سے والہانہ طور پر ملتا، اُس کو بھی معصوم اور شریف سمجھ کر خود سے قریب ہونے کا موقع دیتے۔ کچھ ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی کے نام پر بھی اُن سے قریب ہو گئے تھے، اگر پرویز صاحب کے گھر کے بھیدی ہونے کے ناطے وہ دوسروں کی لنکا ڈھانے کی کوشش کرتے تو بات بھی تھی، لیکن انہوں نے غیر شعوری طور پر کئی "لنکاؤں" کی تعمیر میں مدد دی، اور پرویز صاحب کچھ عرصہ بعد محسوس کرنے لگے کہ وہ کلکتہ میں رام کی طرح بن باس کی زندگی گذار رہے ہیں۔

۵۲ء کے اپریل میں کلکتہ میں کُل ہند امن کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں نے ایسی شاندار کانفرنس اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، اس کانفرنس کے موقع پر جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں پرویز صاحب کی کامیابی مثالی تھی۔ صرف کیفی اعظمی اور نیاز حیدر اس کامیابی میں اُن کے قریب آسکے۔ ویسے مجازؔ، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری وغیرہ بھی اس مشاعرے میں شریک

تھے۔ کرشن چندر، سردار جعفری اور نیاز حیدر کا قیام پرویز صاحب کے یہاں تھا۔ اُن دنوں پرویز صاحب کے پاس ایک ملازم نظیر نام کا تھا۔ ملازم بہت وفادار اور مخلص تھا، لیکن اس کی بعض معصومانہ حماقتوں سے پرویز صاحب اکثر جز بز ہوتے۔ انہی دنوں جب یہ سب مہمان پرویز صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے، نظیر نے پرویز صاحب سے کہا: "جاپھری صاحب لکھنؤ کے نہ لگے ہیں۔ اُد 'میں آتی ہوں'، 'میں جاتی ہوں'، کہاں بولے ہیں!"

۲ر جنوری ۵۳ء سے پرویز شاہدی بھی سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر آگئے، اُن کی تنخواہ دو سو اسی ۲۸۰ رُوپے مقرر ہوئی جو اُس زمانے میں کافی معقول رقم سمجھی جاتی تھی۔ چوں کہ یہاں تنخواہ باقاعدہ تھی، اس لئے پرویز صاحب معاشی طور پر نسبتاً مطمئن نظر آئے۔ رہن سہن میں فرق آیا۔ کچھ نئے کپڑے بھی بنوائے۔ جس دن تنخواہ ملتی، اُس روز وہ اسکول سے فراغت پاتے ہی بار کا رُخ کرتے اور مجھے ہم نوشی کا شرف بخشتے۔ ہاتھ کھُلا ہوا تھا، اس لئے چھوٹے موٹے قرض کی نوبت اب بھی آتی۔ تنخواہ کی کچھ رقم پیشگی لینے کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

ہیڈ ماسٹر اور اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ایک کمرے میں بیٹھتے تھے۔ میں اسسٹنٹ ٹیچر تھا، لیکن پرویز صاحب کی خواہش پر مجھے بھی اُسی کمرے میں بیٹھنا پڑتا، کیوں کہ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ان کی کوئی ذہنی وابستگی نہ ہو سکتی تھی۔ ۵۳ء سے ۵۷ء تک ہم لوگ اسکول میں ساتھ ساتھ رہے۔ اس دوران ان کی زندگی کے تقریباً سارے نشیب و فراز سے مجھے آگاہی ہوئی۔ پرویز صاحب بہت اچھے Conversationalist تھے، ساتھ ہی Extrovert بھی۔ اس لئے وہ اپنے بارے میں بھی ہر اچھی بُری بات بے تکلفی سے بیان کرتے۔ کہا کرتے کہ میری زندگی ایک کھُلی کتاب ہے، اور میری زندگی کی جو سچائیاں ہیں، انہیں میں برسرِ عام کہہ سکتا ہوں۔ اُن باتوں میں بہت سی باتیں ناگفتنی ہیں، اور میرے سینے میں پرویز صاحب کی امانت کی حیثیت سے محفوظ رہیں گی۔

انہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ پرویز صاحب بوتل سرہانے رکھنا تو درکنار، شراب کے ایسے شوقین بھی نہیں کہ اس کے بغیر شام گذار ہی نہ سکیں؛ میں نے خود دیکھا کہ ہفتوں انہوں نے

شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ معاشقے کی داستانیں، جس طرح میں نے سُن رکھی تھیں، سب جھوٹ نکلیں۔ جُزوی سچائیاں سب میں تھیں، لیکن یار لوگوں نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس میں کچھ قصور پرویز صاحب کا تھا، اور زیادہ اُن کم ظرفوں کا جو اُن کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ مشہور شخصیت کا ایک المیہ تو یہ ہے ہی کہ شہرت اور رُسوائی دونوں اسکے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ میں نے کلکتہ ہی کے دورانِ قیام میں یہ شعر کہا تھا:

جہاں امام کے اعزاز میں ہے جلسۂ عام

وہاں سے کوئے ملامت بھی کوئی دور نہیں

سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول سے وابستہ ہونے کے بعد پرویز صاحب کا زیادہ وقت میرے ساتھ گذرتا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ہم لوگ "معاون" کے دفتر (۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ) آجاتے، جہاں میرا مستقل قیام تھا۔ اس رسالے کا ایڈیٹر میں ہی تھا، ہر چند کہ مدیر کی حیثیت سے اس کے مالک ایس۔ ایم۔ عبداللہ کا نام چھپتا تھا۔ عبداللہ صاحب پڑھے لکھے نہ تھے۔ اُردو میں اپنا دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حافظ یوسف دہلوی مدیر "شمع" کے بچپن کے دوست تھے اور انہی کے ایما سے انہوں نے "معاون" کا اجرا کیا تھا۔ عبداللہ صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، اور ادیبوں شاعروں کی بڑی خاطر مدارات کرتے۔ دفتر 'معاون' میں پرویز صاحب شام تک بیٹھا کرتے۔ شعر و شاعری کی محفل جمتی۔ دلچسپ باتیں ہوتیں۔ وقتاً فوقتاً عبداللہ صاحب بھی موجود ہوتے۔ کبھی کبھی ان کے کچھ اور دوست آجاتے۔ دفتر 'معاون' کے اس چھوٹے سے بوسیدہ کمرے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ حافظ یوسف دہلوی جب بھی کلکتے آتے، کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے یہیں قیام کرتے۔ سہیل عظیم آبادی، اعجاز صدیقی، محمد یوسف جامعی مدیر "شاہراہ" اور ارشد کاکوی نے اس کمرے میں کئی بار قیام فرمایا ہے۔ یہیں کئی دلچسپ محفلیں ہوئی ہیں، جن کا تذکرہ الگ مضمون چاہتا ہے۔ اس کمرے کو ل۔ احمد اکبر آبادی، جمیل مظہری، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اشک امرتسری، میر محمود طرزی، پروفیسر عباس علی خاں بیخود، شین مظفر پوری، جرم محمد آبادی، رضا مظہری، پروفیسر شاہ مقبول احمد، سالک لکھنوی

وغیرہ کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہے۔ میں اپنے مقامی اور غیر مقامی ہمعصروں کا ذکر فی الحال نہیں کر رہا ہوں، کیونکہ یہ فہرست بہت طویل ہے۔

ہمارا اسکول بیٹر لین (چونا گلی) میں واقع تھا۔ یہاں سے کولوٹولہ بالکل قریب ہے۔ چوں کہ بیشتر اُردو اخبارات آس پاس سے شائع ہوتے ہیں، اس لئے کوئی نہ کوئی صحافی آتے جاتے مل ہی جاتا تھا۔ ۱۷ اپریل ۵۳ء کے "آزاد ہند" کے فکاہی کالم "نمک دان" میں "نمک پاش سلمہ" نے لکھا:

"آج صبح ہم جیسے ہی گھر سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چونا گلی میں جناب پرویز شاہدی صاحب چلے جا رہے ہیں، اور ان کے ساتھ ہی مظہر امام صاحب بھی ہیں۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ مظہر امام صاحب کے ساتھ ان کے کوئی شاگرد رشید ہیں، کیوں کہ ان کے ساتھ عام طور سے شاگردانِ رشید کی پلٹن رہتی ہے! مگر جب ہم ان کے برابر پہنچے تو پرویز صاحب کو دیکھ کر سخت تعجب ہوا، کہ آخر اس دھوپ میں آپ یہاں کہاں، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بیٹر لین میں اسلامیہ یتیم خانہ کا جو انگریزی اسکول ہے، اس کے ہیڈ ماسٹر آپ ہی ہیں۔ اس انکشاف سے ہمیں تعجب ہوا، درآں حالیکہ تعجب کی جگہ اپنی لاپرواہی کا ماتم کرنا چاہئے تھا کہ ایک زبردست شاعر چونا گلی میں موجود ہو اور ہم ساگردت لین میں رہتے ہوئے، اس سے بے خبر رہیں۔"

فروری ۵۴ء میں اسکولوں میں ایک دن کی ہڑتال ہوئی تھی۔ ۱۱ فروری کے "آزاد ہند" میں اسے فکاہی کالم میں اس طرح لکھا گیا:

"اب ہمیں اُصولاً سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول جانا تھا، کیوں کہ یہاں کے ہیڈ ماسٹر پرویز شاہدی صاحب سے ہماری باقاعدہ علیک سلیک ہے۔ پھر ایک ٹیچر جناب مظہر امام صاحب، جو آسمان کو بغیر اُچکے ہوئے چھونے کا ارادہ کر چکے ہیں، ہمارے باقاعدہ دوست ہیں، مگر وہاں ہم

دیر میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ابھی ابھی تمام حضرات اسکول سے رحلت فرما گئے، اور اس وقت اگر کہیں مل بھی سکتے ہیں تو وہاں جانا اس لئے مناسب نہیں کہ ہر شخص سخت مشغول ہو گا۔ مثلاً پرویز صاحب اپنی مشہور و معروف نظم :

ہم پھر ہڑتال منائیں گے

پر نظر ثانی کرتے ہوں گے اور جناب مظہر امام صاحب اپنی ادھوری غزل :

حُسن کے ساز پہ ہڑتال کے گاتا ہوں گیت

کو مکمل کرنے میں لگے ہوں گے "۔

اس فکاہیہ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہمارے ترقی پسندانہ کردار کو اختلاف کے باوجود محبت اور ہمدردی سے دیکھا جاتا تھا۔

میں کلکتہ میں اُردو اور ہندی کے ترقی پسند مصنّفین کی مشترکہ انجمن کا سکریٹری تھا۔ پرویز صاحب ترقی پسندوں کے درمیان سب سے قابلِ احترام شخصیت تھے۔ وہ ہر ایک سے بے تکلفی اور محبّت سے ملتے، روابط میں ادب اور تہذیب کو بڑی اہمیت دیتے اور اخلاقی قدروں کو بہت عزیز رکھتے۔ کچھ "سرخ" دوست، اسے ان کی جاگیردارانہ ذہنیت پر محمول کرتے۔ چوں کہ میں خود انہی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا پاسدار تھا، اس لئے اس نوع کے طنزیہ یا معترضانہ نشتر اپنے سینے میں بھی محسوس کرتا۔

پرویز شاہدی مشاعروں کے بہت مقبول شاعر تھے۔ بنگال، بہار اور مشرقی پاکستان میں ان کے کلام اور ترنّم کی دُھوم تھی۔ اُن کے کلام کی سطح بلند تو تھی ہی، لیکن مشاعروں کی مقبولیت صرف کلام کے سہارے نہیں ہوتی۔ اس میں شخصیت کے دوسرے پہلو بھی معاون ہوتے ہیں ــــ خصوصاً ترنّم۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پرویز صاحب مشاعروں کی مقبولیت سے مطمئن ہو گئے ہیں۔ اشاعتِ کلام کی جانب سے ان کی بے نیازی میرے اس اندیشے کو تقویت پہنچاتی تھی ــــ غالباً اُن کا کلام محفوظ بھی نہ رہتا اگر ان کے دوست شریف چکوالی

شب و روز کی محنت سے انہیں یکجا نہ کرتے ۔ یہ صحیح ہے کہ پرویز صاحب کے حافظے کی قسم کھائی جا سکتی تھی ۔ شاید مبالغہ نہ ہو اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اپنا سارا کلام حفظ تھا ۔ لیکن اگر شریف کنجاہی کے تیار کردہ مسودے کی وہ وقتاً فوقتاً تلاوت نہ کرتے تو اس بات کا امکان تھا کہ وہ اپنے کلام کے کامیاب حافظ نہ بن پاتے ۔

پرویز صاحب کے کلام کا ایک مجموعہ شریف کنجاہی نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں مرتب کیا تھا ۔ دریائے گنگا پر پرویز صاحب کی ایک پسندیدہ نظم "بنت ہمالہ" تھی ۔ اس لئے مجموعے کا نام "سازِ گنگ" تجویز ہوا ۔ پھر کسی نے توجہ دلائی کہ اسے "سازِ گُنگ" بھی پڑھا جا سکتا ہے ، لہذا اس کا نام بدل کر "صُبحِ نو" رکھا گیا ۔ شریف کنجاہی نے اسے عثمانیہ بُک ڈپو کلکتہ سے شایع کرانے کا بندوبست بھی کیا ۔ پہلے ایڈیشن کے جُملہ حقوق تین سو رُوپے میں فروخت ہوئے ۔ یہ رقم مجموعے کی اشاعت کے بعد ملنی تھی ۔ بہت اہتمام سے کتابت شروع ہوئی ۔ پرویز صاحب کو کتابت شدہ کاپیوں کی تصحیح کرنی تھی ۔ یہ کام ان کے بس کا نہ تھا ۔ کتابت شدہ کاپیاں ایک عرصے تک اُن کے پاس پڑی پڑی خراب ہوگئیں ۔ پھر یہ کہ پرویز صاحب نے موعودہ رقم سے پیشگی لینا شروع کیا ، جو معاہدے کے خلاف تھا ۔ شریف کنجاہی اُن دنوں اپنے وطن پنجاب گئے ہوئے تھے ۔ دل برداشتہ ہو کر ناشر نے مجموعے کی اشاعت کا ارادہ ہی ترک کر دیا ۔

۱۹۵۳ء میں جب پرویز صاحب کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے زیادہ مواقع میسّر آئے تو میں انہیں بار بار احساس دلاتا رہا کہ مجموعہ چھپنے سے پہلے کلام کی اشاعت معتبر اور معروف رسالوں میں ہونی چاہئے ۔ اسے پرویز صاحب کی لا اُبالی فطرت کا نام دیجئے یا اُن کی تساہلی پر محمول کیجئے ، کلام کا نقل کرنا اور اسے رسائل میں بھیجنا اُن کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ۔ وہ پرویز تھے ، شیریں سخنی اُن کے قبضۂ قدرت میں تھی ۔ اس شیریں سخنی کی تشہیر کے لئے "فرہادی" میرے حصّے میں آئی ۔ سہیل عظیم آبادی اپنے رسالے "تہذیب" کے لئے پرویز صاحب سے کبھی کبھار کچھ حاصل کر لیتے تھے ۔ "تضاد" اور "ساتھیو ، خوش آمدید" وہیں چھپی تھیں ۔ ممکن ہے ان کی نقل شریف کنجاہی یا مظہر انصاری نے کی ہو ۔ ۱۹۵۳ء میں یہ فرض میں نے

اپنے سر لیا۔ شاہراہ، شاعر، صبا، سب رس، گجر، فن کار، آئینہ، سہیل، نقوش وغیرہ میں ۵۳ء اور ۵۸ء کے درمیان پرویز صاحب کا جو کلام چھپا، وہ میرے توسط سے چھپا۔ ۵۴ء کے اواخر میں اُن کا مجموعہ میں نے ازسرِ نو مرتب کیا اور شاہراہ بک ڈپو دہلی کے مالک محمد یوسف جامی کو آمادہ کیا کہ وہ اسے اپنے ادارے سے چھاپیں۔ کچھ چیزوں کی شمولیت پرویز صاحب کی خواہش کے مطابق ہوئی، ہر چند میں اس کے حق میں نہ تھا۔ ان ہی کی ایک نظم کے عنوان کی بُنیاد پر میں نے مجموعے کا نام "رقصِ حیات" تجویز کیا۔ پرویز صاحب کو یہ نام بہت پسند آیا۔ بعد میں انہوں نے "تثلیثِ حیات" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور دوسرے مجموعے کا یہی عنوان رکھا۔ اویس احمد دوراں کا بیان ہے کہ "رقصِ حیات" ان کا تجویز کردہ نام ہے۔

پرویز صاحب کے کلام کی اشاعت رسالوں میں باقاعدگی سے ہونے لگی تو پڑھنے والوں کی نگاہیں اُن کی جانب اُٹھیں۔ ہر چند بلند آہنگ ترقی پسندی کا دور ۵۱-۵۲ء تک ختم ہو چکا تھا، لیکن اپنے شاعرانہ محاسن کی بنا پر اس کلام کی بڑی پذیرائی ہوئی اور رسائل کے مدیران کی جانب سے فرمائشوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ یہ وہ دَور تھا جب ادب میں گروپ بندی اور احباب نوازی کے سلسلے میں گرما گرم بحث چل رہی تھی، اور ایک حلقے کی جانب سے یہ آواز اٹھائی جا رہی تھی کہ ادب میں جمود ہے۔ پرویز شاہدی کے کلام کی مسلسل اشاعت دونوں ہی موقف کی تکذیب کرتی تھی۔ انہی دنوں کسی نے لکھا کہ پرویز صاحب کا کلام "شاہراہ" سے واپس آجاتا تھا۔ میں نے اپنے مضمون "ادب میں جمود"، مطبوعہ "سہیل"، گیا مارچ ۵۵ء میں اس کی تردید اِن لفظوں میں کی تھی:

> "پرویز شاہدی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی نظمیں 'شاہراہ' سے واپس آجاتی تھیں۔ مجھ سے زیادہ پرویز صاحب کی قربت کا دعویٰ کم لوگ کر سکتے ہیں، اور میں پورے تیقّن سے کہتا ہوں کہ اُن کا کلام آج تک "شاہراہ" سے واپس نہیں آیا۔ اگر آج سے ایک ڈیڑھ سال پہلے ان کی تحریریں "شاہراہ" میں بہت کم نظر آتی تھیں تو یہ اڈیٹر کا نہیں

بلکہ خود پرویزؔ صاحب کے تساہل اور بے نیازی کا قصور ہے۔"

مجھے دوستوں نے بتایا تھا کہ وہ کئی سال سے اپنی شادی کے لئے کوشاں ہیں ـــــ پرویزؔ صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ شادی اُسی سے کرنا چاہتے ہیں، جس سے وہ جذباتی وابستگی محسوس کریں۔ شاید رفیقۂ حیات ہی کی تلاش میں انہوں نے کئی عشق کئے تھے۔ کچھ کامیاب بھی تھے، لیکن ان میں سے کوئی شادی پر مُنتج نہیں ہوا۔

۵۳ء کے جون میں، جب اسکول میں موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں، میں اپنے وطن آیا ہوا تھا۔ میں نے، منظر شہاب نے اور میرے بھائی حسن امام دردؔ نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا، کیوں کہ پرویزؔ صاحب سے میں نے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر ہم نے دربھنگے میں اس طرح کا کوئی موقع نکالا تو وہ ضرور شرکت کریں گے۔ پرویزؔ صاحب بھی اپنے وطن پٹنہ سیٹی آئے ہوئے تھے۔ میں اُنہیں لانے کے لئے اُن کے لودی کٹرہ کے آبائی مکان گیا تو اُن کی والدہ نے بتایا کہ وہ لڑکی دیکھنے علی گڑھ گئے ہیں۔ مشاعرے میں اُن کی عدم موجودگی سے ہمیں بڑی خفت اٹھانی پڑی، کیوں کہ اُن کے نام کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ کلکتہ میں پرویزؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے بتایا کہ اچانک پروگرام بن گیا' والدہ کا اصرار تھا، لڑکی میں مجھے کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی، یوں بھی وہ بہت کم عمر اور ذہنی طور پر نا پختہ تھی۔

۵۴ء کے جون میں ہم لوگوں نے پھر دربھنگے میں مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس بار پرویزؔ صاحب خود ہی مقررہ تاریخ سے کئی روز پہلے آگئے، اور ان کی آمد سے "امیر منزل" کئی دنوں تک شعر و ادب کی آماجگاہ، قہقہہ زار اور زعفران زار بنی رہی۔

جوشؔ ملیح آبادی ۵۵ء کے اگست میں ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے۔ ۵۴ء کے اواخر میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں وہ آخری بار کلکتے آئے۔ جوشؔ سے پرویزؔ صاحب کے پرانے مراسم تھے۔ ایک شام انھوں نے پرویزؔ صاحب کی رہائش گاہ پر گذاری۔ ایک بہت مختصر اور مخصوص صحبت تھی۔ جوشؔ، پرویزؔ شاہدی، جمیلؔ مظہری، رضا مظہری، آغا نشتر کاشمیری (آغا حشر کے چھوٹے بھائی)، سالک لکھنوی، میرے ایک دوست شاہد جمیل اور میں۔ وِھسکی کی

دو بڑی بوتلیں تھیں۔ ایک کا انتظام سالک لکھنوی نے کیا تھا اور ایک کا شاہد جمیل نے۔ جمیل مظہری اور رضا مظہری صرف سوڈے پر اکتفا کر رہے تھے۔ مشروب پیش کرنے کی ذمہ داری میرے سر تھی۔ جوش نے سات آٹھ پیگ پئے ہوں گے، مگر ان کی کسی حرکت سے نشہ کا اثر ظاہر نہ تھا۔ آغا نشتر مسلسل بولتے رہے۔ جوش بالکل خاموش تھے، اور ایسا لگتا تھا کہ تکدر محسوس کر رہے تھے۔ جوش صاحب نے اپنی کئی نظمیں سنائیں ۔ اپنے مخصوص طنطنے کے ساتھ، جو اُن پر ہی ختم ہے۔

مجھے یاد نہیں پرویز صاحب نے کتنے پیگ پئے۔ زبان کی لڑکھڑاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ نشہ کا اثر ہے، لیکن کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔ دوسرے دن وہ اسکول نہیں آئے۔ چھٹی کی درخواست آئی، اور میرے لئے اطلاع کہ انہوں نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ اسکول سے فراغت پاکر میں سہ پہر کو اُن کے یہاں پہنچا۔ میں نے خیریت دریافت کی۔

بولے: "نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ بس ذرا طبیعت کسل مند تھی، اس لئے آرام کر رہا ہوں۔" پھر مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگے: "رات مجھ سے کوئی بدتمیزی تو نہیں ہوئی؟"

میں نے تیقّن سے عرض کیا: "نہیں، بالکل نہیں۔"

کہنے لگے: "مجھے ایسا احساس رہا کہ میرا ہاتھ جوش صاحب کے جسم پر کسی غلط جگہ پر پڑ گیا۔ رات سے سخت پشیمانی ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا: "یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں لوگوں کی پوشیدہ حرکات و سکنات پر نگاہ نہیں رکھتا۔"

پرویز صاحب بھی ہنسنے لگے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ یہ کہتے ہوئے کہ "میں بھی کیا احمق ہوں" اپنی بذلہ سنجی کے جادو جگانے لگے۔

۵۳ء کے اواخر یا ۵۴ء کے اوائل میں پرویز صاحب کے تعلقات کلکتہ کی ایک جانی پہچانی مسلمان خاتون سے قائم ہوئے جو نسبتاً ایک اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، اور اُن دنوں شاید آنریری مجسٹریٹ تھیں۔ پرویز صاحب کی اکثر شامیں وہیں گذرتیں۔ وہ ہر روز مجھے وہاں کی روداد تفصیل سے سُنایا کرتے۔ خاتون موصوف اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔

خوش شکل تھیں، گفتگو کا ایسا سلیقہ رکھتی تھیں جو دوسروں کو اپنی جانب کھینچ سکے۔ احمداللہ انصاری بزمی بھی اُن کے گرفتاروں میں تھے۔ اُن کی لگاوٹوں کی کئی داستانیں مشہور تھیں۔ خود پرویز صاحب ان کی تصدیق کرتے۔ میں نے ایک دفعہ اُن سے کہا، "پھر آپ ایسی عورت سے کس طرح شادی کریں گے، جس کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ اس کے تعلقات دوسروں سے بھی رہے ہیں۔" علی گڈھ مڈیکل کالج کے شعبۂ جرّاحی کے صدر ڈاکٹر نسیم انصاری، جو اُن دنوں کلکتہ میں میڈیکل اسٹوڈنٹ تھے، اور ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے، اُس وقت موجود تھے۔ پرویز صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا: "کیا آپ ایسی لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کریں گے جس سے آپ کو محبّت ہو، لیکن جس کے بارے میں پتہ ہو کہ وہ پہلے کسی اور سے بھی محبت کر چکی ہے؟"
میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا: "اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ اُس کے جنسی تعلقات کسی اور سے رہ چکے ہیں، تو میں شادی نہیں کروں گا۔"

پرویز صاحب کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ "یہ افسوسناک ہے۔ آپ ترقی پسند ہو کر ایسا کہتے ہیں۔"

نسیم انصاری جو ہم لوگوں کی باتوں سے لُطف لے رہے تھے، تھوڑے سے توقف کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر بول پڑے: "اِس کا مطلب یہ ہے کہ پھر آپ کی شادی ہم لوگوں کے گھر میں نہیں ہو سکتی۔"

بات ہنسی مذاق میں ختم ہو گئی۔ پرویز صاحب کچھ دنوں تک اُس خاتون سے شادی کے معاملے میں کافی سنجیدہ رہے، لیکن پھر آپس کے اختلافات بڑھنے لگے۔ مجھے یاد نہیں، سبب کیا تھا، اور پہل کس کی جانب سے ہوئی تھی۔ کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ وہ خاتون Flirtation کی قائل تھیں اور شادی کے سلسلے میں سنجیدہ نہ تھیں۔ جن دنوں "رقصِ حیات" کی ترتیب ہوئی، اُن سے پرویز صاحب کا سلسلہ عروج پر تھا۔ اس مجموعے کی آخری غزل ان ہی دنوں کی یادگار ہے۔ میں اس غزل کی شمولیت کے حق میں نہیں تھا، لیکن پرویز صاحب نے کہا کہ یہ اُن خاتون کی خواہش ہے۔

ایک بار میں نے نامہ بَر کا فرض بھی انجام دیا تھا۔ یاد نہیں کس نوعیت کا خط تھا، البتہ وہ اتنا ضروری تھا کہ مجھے اسکول کے اوقات کے دوران ہی اس کا جواب لانا تھا ـــــ شاید اُسی شام پرویز صاحب کی ملاقات اُن خاتون سے ہوئی۔ دوسرے دن ہنس کر کہنے لگے: "آپ کو وہاں بھیجنا میرے حق میں نقصان دہ ہوا۔ وہ کہنے لگیں، دیکھئے مظہر امام صاحب کیسے presentable انداز میں رہتے ہیں، اور آپ ہیں کہ......"

میں نے عرض کیا: "اطمینان رکھئے، رازدار ہونے کے باوجود میں آپ کا رقیب بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑی ہیں۔"

مِس فضیلت النساء بیگم بی۔اے، بی۔ٹی کی منسوب رضا مظہری صاحب کے توسط سے آئی تھی۔ پرویز صاحب انہیں کئی سال پہلے کسی ادبی محفل میں دیکھ چکے تھے، اور اُن کی جانب کھنچے بھی تھے۔ لیکن جب انہیں اطلاع ملی کہ فضیلت النساء فی الحال شادی کے لئے آمادہ نہیں ہیں، تو پرویز صاحب نے ان کا خیال دل سے نکال دیا، اور اپنی تنہائی کا مداوا ایک آستاں سے دوسرے آستاں میں ڈھونڈتے رہے۔ ان کی جبین شوق ہر آستاں سے ناکام و نامراد لوٹ آئی۔ ۵۵ء میں جب انہیں اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے امکانات نظر آئے تو پرویز صاحب بہت خوش دکھائی دینے لگے۔ لیکن اِس دَوران وہ کئی جذباتی مدوجزر کا شکار ہوئے۔ اس رشتے میں رخنہ ڈالنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ کبھی عمر کی آڑلی گئی، کبھی یہ کہا گیا کہ پرویز صاحب کمیونسٹ اور مُلحد ہیں۔ ہر وقت شراب میں غرق رہتے ہیں، وغیرہ۔ شاید اس طرح کے پراپگنڈے کا اثر ہو جاتا، لیکن خود فضیلت صاحبہ نے اس طرح کے فضول الزامات کو اہمیت نہ دی اور ساری مخالفتوں کے باوجود وہ ثابت قدم رہیں۔ پرویز صاحب روز روز کے Development سے مجھے آگاہ کرتے رہتے۔

کبھی کبھی وہ بہت مایوس ہو جاتے۔ اسی مایوسی کے عالم میں انھوں نے ایک غزل کہی تھی، جس کے یہ چند اشعار ہیں:

مِرے غم کو نہ کیجئے تازہ دَم، ہوسِ خوشی سے نہ کھیلئے
مری زندگی ہے تھکی ہوئی، مری زندگی سے نہ کھیلئے

مرے چلتے رہنے پہ منحصر ہے دلوں کے قافلے کا سفر
میں چراغِ راہ گذر سہی، مری روشنی سے نہ کھیلئے
مرے شوق کو نہ جگایئے، مرے حوصلے نہ بڑھایئے
مرے دل کے پاس نہ آیئے، مری بے دلی سے نہ کھیلئے

یہ غزل "سہیل" (نومبر ۵۵ئہ) میں میرے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اُس کے یہ حصّے میں دُہرانا چاہتا ہوں :

"ہم سب لوگ پرویز شاہدی کو ایک رجائی، عزم پرور اور پُرجوش شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ زندگی کے کڑے وقت میں بھی اُن کے پائے فکر میں یاسیّت کی لغزش نہیں آئی، بلکہ میری ذاتی رائے تو یہاں تک رہی ہے کہ ان کی رجائیت کبھی کبھی غلو اختیار کر کے فرار کی سرحدوں کو چھُو لیتی ہے۔ آج سے قریباً دو سال پہلے میں نے ان سے مخاطب ہو کر یہ شعر کہا تھا :

لبِ مستقبلِ زرّیں پہ تبسّم ہی سہی
دیدۂ حال میں جلتے ہوئے آنسو بھی تو دیکھ

خود پرویز صاحب کے قول کے مطابق ان کے 'بے باک استعاروں' میں 'مشقّت کی روحِ صناعی' ہے۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے :

موقعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی، مجھے مرنے نہ دیا

لیکن اب وہ کہتے ہیں :

مری زندگی ہے تھکی ہوئی، مری زندگی سے نہ کھیلئے

اب نہ وہ اپنے خوابیدہ شوق کو جگانا چاہتے ہیں اور نہ اپنے واماندہ حوصلوں کو طاقت بخشنا۔۔۔ ایک عام قاری کا یہ سوال حق بجانب ہو گا کہ آیا اس طرح

کے یاس انگیز تاثر کے لئے صحت مند ادب میں کوئی جگہ ہے یا نہیں اور کیا کسی باشعور شاعر کو اِن خیالات کے اظہار کا حق پہنچتا ہے؟..... اس متنازعہ فیہ مسئلہ میں بعض رفیقوں کے اختلاف کے باوجود میں یہ سمجھتا رہا ہوں کہ اس طرح کے حُزنیہ احساسات کو بھی شعری جامہ پہنایا جا سکتا ہے ...... شاعر ہو یا ادیب، سچ بولنے کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا"..

پرویز شاہدی جب شادی کے لئے بہت بیتاب ہوئے تو انھوں نے یہ اشعار کہے :

کل کا کچھ اعتبار نہیں، جلد آئیے
اب تابِ انتظار نہیں، جلد آئیے

کلیاں ہیں فیضِ سُرخیٔ عارض کی منتظر
رنگین اب بہار نہیں، جلد آئیے

دیجے سزا نہ دل کو مرے اضطراب کی
لیجے، میں بے قرار نہیں، جلد آئیے

شکووں کی گرد اشک کی بارش میں دُھل گئی
دل میں مرے غبار نہیں، جلد آئیے

دُھلتا نہیں شراب سے مُنہ اضطراب کا
میں کوئی بادہ خوار نہیں، جلد آئیے

تنظیمِ شوق کے لئے فرصت نکالئے
اب وقتِ انتشار نہیں، جلد آئیے

غم آپ کا رفیقِ غمِ کائنات ہے
میں قائلِ فرار نہیں، جلد آئیے

عجلت بس آرزو ہے، نہ تاخیر کیجئے
میں یاس کا شکار نہیں، جلد آئیے

آرائشِ حیات میں تعجیل چاہیے
بے وجہ انتظار نہیں، جلد آئیے
اب عُذرِ امتحانِ تمنّا نہ ڈھونڈیئے
کیا مجھ پہ اعتبار نہیں، جلد آئیے
پرویز کی رفاقتِ افکار کیجئے
تنہائی سازگار نہیں، جلد آئیے

ممکن ہے عام پڑھنے والوں کو ان اشعار میں بہت دلچسپی نہ ہو، لیکن جو لوگ پرویز صاحب کے اُس زمانے کے حالات سے واقف ہیں، اور جو اُن کی ذہنی کیفیات میں شریک رہے ہیں، وہ ہر شعر کے معنی و مفہوم کا لطف لے سکتے ہیں۔ فیضِ سُرخیٔ عارض، میں بے قرار نہیں، شکووں کی گرد، میں بادہ خوار نہیں، تنظیمِ شوق اور انتشار آسا زندگی سے نجات پانے کی خواہش، آرائشِ حیات کی تمنا۔

پرویز صاحب رجاو نشاط کے شاعر تھے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی مایوسی سے نبرد آزما رہتے۔ ان کی حسِ مزاح (Sense of humour) بہت تیز تھی۔ وہ اپنی حاضر جوابی (wit) سے، اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنائے رہتے۔ لیکن میں نے ان دنوں پرویز صاحب کو اس کیفیت میں بھی دیکھا ہے جیسے وہ بالکل ٹوٹ رہے ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے۔ میں نے انہی دنوں چلتے چلتے ایک مصرع کہا تھا:

میں نے پرویز کی آنکھوں کو بھی نم دیکھا ہے

یہاں زور "بھی" پر ہے۔

پرویز صاحب کی شادی ہنگامہ خیز تھی ——— لغوی معنی میں۔ دن رات کا یہی موضوعِ سخن تھا۔ جو واقعی دوست تھے، وہ خوش تھے۔ دشمنوں کا حال پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔ جو نہ دوست تھے، نہ دشمن، اُن کا انداز بھی تمسخرانہ تھا۔ پرویز صاحب کو ان باتوں کی بھنک کسی نہ کسی ذریعے سے مل ہی جاتی تھی۔ میں ہمیشہ محتاط رہا کہ وہ باتیں میری زبان سے اُن تک

نہ پہنچیں، جن سے انہیں تکلیف ہو۔

۶ نومبر ۱۹۵۵ء کو دن کے گیارہ بجے اُن کا نکاح ہوا۔ بڑی پُر رونق محفل تھی۔ نکاح کے بعد، تہنیتی نظموں اور سہروں کا ایک مشاعرہ ہوا۔ جی ہاں، یہ باقاعدہ مشاعرہ ہی تھا۔ پندرہ سولہ شاعروں نے خراجِ تہنیت پیش کیا۔ نظامت کے فرائض میں انجام دے رہا تھا۔ اس محفل میں جمیل مظہری اور میری نظمیں بہت پسند کی گئیں۔ ابراہیم ہوش نے اپنے اخبار "آبشار" (۷ نومبر) میں اس تقریب کی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے تین سُرخیاں لگائیں:

"شاعرِ انقلاب پرویز شاہدی کی زندگی میں نیا انقلاب۔
رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ دلچسپ اور مبارک تقریب۔
شادی کی تقریب میں معزز اور بزرگ ہستیوں کا اجتماع۔"

انہوں نے اشک امرتسری کا یہ شعر بھی نقل کیا، جو پرویز صاحب کی شادی کی اطلاع پا کر بے ساختہ کہا گیا تھا:

روز کہتے تھے وہ آئے گا وہ آئے گا ضرور
آخرش ۱۹۵۵ء میں آیا انقلاب

ان دونوں نظموں کا ذکر کرتے ہوئے ابراہیم ہوش نے لکھا:

"پھر جناب مظہر امام نے اپنی نظم سُنائی، جو اتنی اچھی، اتنی پاکیزہ، اتنی بلند اور اتنی برمحل تھی کہ تمام حاضرین نے دل کھول کر داد دی اور بے حد سراہا۔"

"...... ان کے بعد علامہ جمیل مظہری نے ایک ایسی نظم سنائی، جو بلا مبالغہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کا ہر بند اتنا مرصع، اتنا سجا ہوا اور اتنا بلند تھا، جو علامہ ہی کے بس کی بات ہو سکتی تھی۔"

ابراہیم ہوش نے تیرہ سال بعد اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا: "شادی کے موقع پر بہت سے

شعرا نے سہرے اور تہنیتی نظمیں پڑھیں، لیکن مظہر امام صاحب کی تہنیتی نظم سبھوں پر سبقت لے گئی۔"

جمیل مظہری قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ تہنیتی نظمیں اور سہرے اکثر لکھتے رہے ہیں، ان کی مشاقی کا کون قائل نہیں۔ ان کی نظم کی شاعرانہ قدر و قیمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ مثال کے لئے محض ایک بند کافی ہے:

یہ کس کا جشنِ عروسی ہے، مرحبا پرویز!
یہ رَن بھی جیت لیا تو نے، ہاتھ لا پرویز!
بس ایک گھونٹ، پیالہ ادھر بڑھا پرویز!
جوان تو ہے، تو حیرت ہے تجھ کو کیا پرویز!
اگر ہمارا بڑھاپا شباب بنتا ہے
یہ وقت وہ ہے کہ پانی شراب بنتا ہے

میری نظم شاعرانہ اعتبار سے کیسی تھی، میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرے خلوص اور دلی جذبات کی آئینہ دار ضرور تھی۔ پرویز صاحب سے گذشتہ تین چار سال کے دوران میرا جو Association رہا تھا اور دو ڈھائی سال کے دوران جو قربت رہی تھی، ان سب کے پیش نظر میں نے یہ نظم کہی تھی۔ اسی لئے وہ نظم عام تہنیتی نظموں سے مختلف تھی، اور شاید اسی سبب سے کچھ لوگوں کو سب سے زیادہ پسند آئی۔ جمیل صاحب کی نظم ایک بے تکلف، محبوب دوست کی تقریب شادی پر ہے، لیکن شاعر پرویز پر نہیں۔ میری نظم ایک بزرگ دوست پر ہی نہیں، ایک ترقی پسند، نقیب انقلاب شاعر پرویز شاہدی پر بھی ہے۔ دونوں نظموں کا یہی بنیادی فرق ہے۔ مثلاً میری نظم کا یہ بند:

زلف گیتی میں ابھی تک ہے شکن، یاد رہے
ہے وہی اب بھی زمانے کا چلن، یاد رہے

خون روتے ہیں ابھی سرو وسمن، یاد رہے
ہے ابھی خاک بسر رُوحِ وطن، یاد رہے
شمعیں محرابِ محبت میں فروزاں کرنا
ساتھ ہی فکرِ علاجِ غمِ دوراں کرنا

علامہ جمیل مظہری کے بارے میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا کلام نذر کرکے انہیں شاعر بنا ڈالتے ہیں۔ اصلاح بھی دیتے ہیں تو ایسی کہ کسی خود دار شخص کو دوبارہ شعر کہنے کی جرأت نہ ہو۔ سہیل عظیم آبادی نے کہیں لکھا ہے کہ وہ سہیل جمیلی سے سہیل عظیم آبادی اس لئے بنے کیوں کہ اُن کی اصلاح شدہ غزل میں بہ مشکل ایک ڈیڑھ مصرع ان کا اپنا رہ جاتا تھا۔ شاید اسی نفسیات کی بنا پر جمیل صاحب عموماً نو عمر شاعروں کا اچھا کلام سُن کر اُس کے بارے میں مشکوک ہو جاتے۔ علامہ میرا کلام پہلے بھی سُن چکے تھے اور کبھی کبھی مبالغہ آمیز تعریف کر چکے تھے۔ لیکن شاید ایسی تہنیتی نظم کی توقع اُنہیں مجھ سے نہ تھی۔ محفل میں اور محفل ختم ہونے پر انہوں نے اس نظم کی تعریف تو بہت کی، لیکن میرے رخصت ہونے کے بعد پرویز صاحب سے کہا: "تم نے ایسی نظم لکھ کر مظہر امام کو دے دی اور مجھے ذلیل کرایا۔ تم مجھ سے کہتے، میں بھی اسی انداز کی نظم کہتا۔" پرویز صاحب نے دوسرے دن مجھ سے یہ بات کہی۔ میں نے بہت محبت اور بہت محنت سے رات بھر جاگ کر یہ نظم کہی تھی۔ میں اُن دنوں زکام میں مبتلا تھا، اس لئے رات بھر جاگنے کا اثر میری آواز پر بہت بُرا پڑا تھا۔ مجھے علامہ کی یہ بات سخت ناگوار گذری۔ میں انہیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھتا رہا ہوں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا برابر قائل رہا ہوں۔ لیکن اس بات سے میں سخت پیچ وتاب کھاتا رہا۔ شاید کوئی اور ہوتا تو بدتمیزی پر اُتر آتا، لیکن میں نے کسی مناسب موقع کے لئے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔

اس کے چند ماہ بعد ایک نجی صحبت میں، جس میں جمیل صاحب، پرویز صاحب اور میرے علاوہ کوئی اور نہ تھا، مجھے اپنی خلش کی تسکین کا ایک موقع ہاتھ آیا۔ جمیل مظہری، وحشت کلکتوی کے شاگرد ہیں اور اپنے اُستاد سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ وحشت صاحب

شمس کلکتوی کے شاگرد تھے۔ میں نے اس صحبت میں علامہ سے کہا: "یہاں کچھ لوگ بڑے کمینے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ 'دیوان وحشت' ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت وحشت صاحب کی عمر ۲۷۔۲۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں اتنا اچھا کلام کوئی کہہ ہی نہیں سکتا۔ یہ سارے کا سارا کلام شمس کلکتوی کا کہا ہوا ہے۔" علامہ بہت جزبز ہوئے۔ چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں تھے۔ بولے "نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

میں نے عرض کیا: "میں کب کہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں یہاں وحشت کا مخالف حلقہ موجود ہے۔ وہ ایسی باتیں اُڑاتا رہتا ہے۔" جمیل صاحب دیر تک خاموش اور مضطرب رہے اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

پرویز صاحب کی شادی کی خوشی میں ۲۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو ان کے احباب کی جانب سے کلکتہ کے براڈوے ہوٹل میں انہیں اور ان کی اہلیہ کو ایک پُر تکلف استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقع پر میری تہنیتی نظم "رُوحِ شباب" کاغذی رومال پر چھپ کر تاج پریس، کلکتہ کی جانب سے تقسیم کی گئی۔ اس تقریب سے چند روز پہلے رُومال چھپ کر آگیا تھا اور میں نے خوشی خوشی اسے پرویز صاحب کو دکھایا۔ نظم کے عنوان کے نیچے تحریر تھا:

[دوست، بزرگ اور رہنما جناب پرویز شاہدی کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر]

پرویز صاحب نے دیکھا تو بجائے خوش ہونے کے خاموش ہوگئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں لفظ "دوست" کا استعمال ناگوار گذرا ہے۔ پرویز صاحب مجھ سے عمر میں بیس بائیس سال بڑے تھے۔ اور تمام بے تکلفی کے باوجود، میں خُردی اور بزرگی کا فاصلہ برقرار رکھتا تھا۔ میں نے عرض کیا "دوست، بزرگ اور رہنما" دراصل میں نے "Friend, Philosopher and Guide" کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا، آپ کے تئیں اپنا Compliment اور کس طرح پیش کر سکتا تھا۔ میں نے لفظی ترجمہ 'فلسفی' نہ کر کے آپ کو اپنا بزرگ کہا ہے۔ رہنما تو آپ ہیں ہی، میں نے آپ کی صحبت سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ رہ گیا لفظ 'دوست'، یہ 'لنگوٹیا یار' کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ ہمدرد، خیر خواہ اور

شفقت رکھنے والے کے معنی ہیں۔ اور یوں خود آپ نے اپنے 'حلقۂ احباب' میں شامل کرکے مجھے اعزاز بخشا ہے۔ آپ نے خود مجھ سے ایسی بہت سی باتیں کہی ہیں، جو ہر ایک سے نہیں کہی جاسکتیں۔ ظاہر ہے کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کرکے ہی وہ باتیں کہی ہیں۔ میں آپ کا رازدار ہوں۔ اگر میں صرف دوست کہتا تو شاید کچھ لوگ یہ کہتے کہ میں show off کر رہا ہوں، لیکن زور 'بزرگ اور رہنما' پر ہے۔"

پرویز صاحب کے انکسار، ملنساری اور بے تکلفی کے باعث بہت سے ایرے غیرے بھی اُن سے liberties لینے کی کوشش کرتے۔ شادی سے پہلے وہ کچھ اتنے سخت مراحل سے گذرے تھے اور انہیں بدنام اور رُسوا کرنے کی اتنی کوششیں کی گئی تھیں کہ وہ ان دنوں کافی Touchy ہو گئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بارے میں کوئی ایسا لفظ بھی استعمال کیا جائے جس سے کسی نہ کسی اعتبار سے ان کی اہمیت میں کمی ہوتی ہو۔

پرویز صاحب میرے جواب سے بہ ظاہر مطمئن ہو گئے اور مطبوعہ رُومال کے حسن کی تعریف کرنے لگے۔

شادی کے دوسرے یا تیسرے دن پرویز صاحب نے بیگم کے ساتھ ایک تصویر اسٹوڈیو میں کھنچوائی۔ تصویر بہت خوبصورت آئی تھی۔ مسز فضیلت پرویز واقعی خوش جمال خاتون تھیں ــــ جمالیات کے کسی بھی نقطۂ نظر سے۔ پرویز صاحب بھی نئی شیروانی میں بنے سنورے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ انہوں نے وہ تصویر مجھے دکھائی تو میں غایت مسرت میں بے ساختہ بول اُٹھا:

"واہ، کیا عمدہ تصویر آئی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس سے عشق کیا جائے۔"

پرویز صاحب کے تیور سے ظاہر ہوگیا کہ انہیں یہ بات بُری لگی۔ میں فوراً Conscious ہوگیا کہ شاید مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے۔ میں نے عرض کیا: "بیگم پرویز میری بھابھی ہوتی ہیں، اور ان سے ایسا معصوم مذاق جائز ہے۔ اور آپ سے تو میں اس سے بڑی گستاخیاں

کرتا رہا ہوں اور آپ محظوظ ہوتے رہے ہیں۔"

میں پہلے کہہ چکا ہوں، پرویز صاحب اُن دنوں بہت Touchy ہو رہے تھے۔

پرویز صاحب مزاجاً Bohemian تھے۔ کپڑوں پر شکنیں پڑی ہوئی، کالر گندے، جوتے مرمت اور پالش کے محتاج۔ میں موقع بے موقع دبے لفظوں میں ان کی توجہ اس طرف مبذول کراتا رہتا۔ مجھے اُمید تھی کہ شادی کے بعد اُن کے رہن سہن میں تبدیلی آئے گی۔ چند روز میں نے انہیں بہت اچھے انداز میں دیکھا، اور دل ہی دل میں ان کے سلیقے کی داد دی۔ لیکن شادی کے دس بارہ دن بعد میں شام کے وقت راکسی سینما کے پاس سے گذر رہا تھا کہ پرویز صاحب بھی اپنی بیگم کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ بیگم پرویز بہت سلیقے سے رہتی تھیں اور اُن کی وضع قطع سے نئی شادی کے سارے آثار ظاہر تھے۔ لیکن پرویز صاحب اپنے پُرانے انداز میں نظر آئے۔ لباس سے بدسلیقگی نمایاں تھی قمیص کا کالر مڑا ہوا، میلا چکٹ۔ مجھے دل ہی دل میں بڑا غصہ آیا کہ انہیں اپنا لحاظ نہیں تو بیوی کا خیال تو کیا ہوتا۔ اُسی شام شریف چکوالی سے ملاقات ہوئی تو وہ پرویز صاحب کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ میرا غصہ تازہ تھا میں نے کہا: "پرویز صاحب پر شادی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ بدلنے والے نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں دیکھا۔ وہ فضیلت بھابھی کے ساتھ سینما جا رہے تھے۔ اپنی ہیئت کذائی سے وہ اپنے ساتھ کی خاتون کے دلال لگ رہے تھے۔" مجھے احساس ہے، یہ جملہ بہت بدتمیزانہ اور سخت اشتعال انگیز تھا۔ لیکن اس وقت میں غصے میں بھرا ہوا تھا، جس کا اظہار پرویز صاحب کے ایک دوست کے سامنے ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ شریف چکوالی اس بات کو پرویز صاحب یا کسی اور سے نہیں کہیں گے، لیکن دو تین دن بعد پرویز صاحب نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا۔ شکر ہے، بہت نرمی کے ساتھ۔ ان کے چہرے پر کوئی خفگی نہ تھی۔ بولے: "میں جانتا ہوں آپ نے یہ بات مجھ سے محبت کی بنا پر کہی ہے، لیکن اس کا اظہار ہر ایک سے نہیں کرنا چاہئے۔" میں پانی پانی ہو گیا۔

کلکتہ کے دورانِ قیام میں ہندی کے ایک تعلیمی کورس سے متعلق ہونے کے باعث

میرا اور ایک بنگالی لڑکی مس سربانی بھٹاچاریہ کا ساتھ ہوا - وہ مدنا پور کی رہنے والی تھی۔ تاریخ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اسے ادب، شاعری اور فنونِ لطیفہ سے بہت دلچسپی تھی، جیسی عموماً بنگالیوں کو ہوتی ہے۔ ذوق کی یکسانیت کے سبب ہم دونوں بہت قریب آ گئے تھے اور ہم سبق دوستوں میں موضوعِ گفتگو بھی بننے لگے تھے۔ مس بھٹاچاریہ نے پرویز صاحب کو دیکھا نہ تھا، مگر اس نے ان کا نام، ان کی شاعری، ان کے مارکسی رجحان، ان کی رومان پرستی وغیرہ کے بارے میں سُن ضرور رکھا تھا کیوں کہ پرویز صاحب کافی دنوں تک مدنا پور میں رہ چکے تھے، جہاں ان کی شخصیت اور شاعری کے چرچے تھے۔ ان کی عُمر کے بارے میں دریافت کرنے پر میں نے مس بھٹاچاریہ سے یوں کہا تھا:

"He may be around 45, but he looks much younger than what he really is."

(عُمر تو ۴۵ کے آس پاس ہوگی مگر وہ اصل عمر سے بہت کم نظر آتے ہیں)

میں نے پرویز صاحب سے ذکر کیا تو کہنے لگے: "آپ مجھ سے ملوائیے، میں آپ کے لیے راستہ ہموار کر دوں گا۔"

میں نے عرض کیا: "آپ نے خطرناک جملہ استعمال کیا ہے۔" پرویز صاحب اپنے جملے کی معنویت کو محسوس کر کے اپنے مخصوص انداز میں ہنسے۔ میں نے بات جاری رکھی: "میں آپ سے ملوا کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بہت تجربہ کار ہیں۔ لیکن مجھے خود ہی کچھ سیکھنے دیجیے ___ Trial and error method سے ہی سہی۔"

پرویز صاحب نے دعا دی: "خدا آپ کو کامیاب کرے۔"

۵۸ء کے اپریل میں میری شادی ہوئی۔ پرویز صاحب نے بڑے چاؤ سے ایک فکری نظم لکھی ___ "روایتِ آدم"۔ یہ نظم "شاخِ حنا" میں چھپی، پھر "شاہراہ" میں۔

یہ نظم انہوں نے "بزم احباب" کی ایک نشست میں پڑھی بھی تھی۔ مئی کے پہلے ہفتے میں غالباً موتی ہاری میں کوئی مشاعرہ تھا۔ پرویز صاحب وہاں سے واپس ہوئے تو در بھنگے آ گئے اور میری بیوی کو بزرگانہ شفقت کے ساتھ ساڑی کا تحفہ پیش کیا۔ ۵۸ء کے فروری میں ہی وہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہو گئے تھے، اس لئے اب ملاقاتیں اتنی پابندی سے نہیں ہوتی تھیں۔ کلکتے کی ادبی محفلوں میں ان کی شرکت یوں بھی کم ہو گئی تھی۔ دسمبر ۵۸ء کے اواخر میں مجھے آل انڈیا ریڈیو میں جگہ مل گئی اور میں نے کلکتے کو خیر باد کہا۔ کلکتے نے میری کتنی پذیرائی کی، اور رخصت ہونے سے پہلے اپنی محبت اور خلوص کے کتنے پھول نچھاور کئے میں ان کا ذکر کر کے جذباتی بننا نہیں چاہتا۔ اور اُن باتوں کا تعلق اِس مضمون سے ہے بھی نہیں، لیکن میں اپنے سلسلے میں دی ہوئی ایک الوداعی پارٹی کا تذکرہ اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں پرویز صاحب اپنی عدم موجودگی کے باعث نمایاں (conspicuous) تھے۔ اس الوداعی پارٹی کا دعوت نامہ سالک لکھنوی، اصغر راہی، قیصر شمیم، حرمت الاکرام اور شہزاد منظر کی جانب سے تقسیم ہوا تھا اور اس میں "آبشار" کی رپورٹ کے مطابق "شہر کے سارے ہی ممتاز شعراء اور ادبا موجود تھے۔" سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، علقمہ شبلی، احمد اللہ انصاری بزمی، پروفیسر عباس علی خاں بیخود اور ل۔ احمد اکبر آبادی نے تقریریں کی تھیں۔ مجھے یاد نہیں، پرویز شاہدی نے اپنی غیر حاضری کے لئے کیا جواز پیش کیا تھا، لیکن مجھے ایسا احساس رہا کہ انہیں میری جانب سے کچھ نہ کچھ بدگمانی ہے۔ پرویز صاحب نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، اس لئے ممکن ہے میرا ہی شبہ غلط ہو۔

کٹک کے چار سالہ قیام کے دوران کلکتہ سے میرا رشتہ ٹوٹا نہیں۔ کٹک سے وطن یا دہلی جاتے ہوئے مجھے کلکتہ سے گذرنا ہی پڑتا۔ پھر کلکتہ کے مشاعروں میں بھی شرکت ہوتی رہی، اس لئے پرویز صاحب سے ہر موقع پر، مختصر ہی سہی، لیکن ملاقات ضرور ہو جاتی۔ اسی دوران جمشید پور اور راؤر کیلا کے مشاعروں میں بھی اُن سے ملاقاتیں رہیں۔ جمشید پور میں ان کا قیام میرے بہنوئی منظر شہاب کے یہاں تھا، اس لئے ہم مستقل ساتھ رہے۔ خط و کتابت باقاعدگی سے جاری تھی۔ اُس وقت کے ان کے بعض خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان سے پرویز صاحب

کے ادبی مزاج اور شعری رفتار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ہم لوگوں نے کٹک میں بڑے پیمانے پر "یوم جگر" منایا۔ میری دعوت پر پرویز صاحب تشریف لائے۔ ہمارے یہاں قیام فرمایا۔ میرے بیٹے مون (شہیر امام) کو انہوں نے دیکھا نہ تھا۔ اس کے لئے کپڑے لائے تھے۔ پرویز صاحب آئے تو جوتے میں کئی پیوند تھے۔ شیروانی اپنے پہننے والے کا ماتم کر رہی تھی۔ میری بیوی نے شیروانی پر استری کرائی اور خود جوتے پر پالش کی۔ وہاں وہ مقررہ پروگرام سے زیادہ ہی ٹھہرے۔ میں اسٹیشن پر انہیں چھوڑنے آیا تو وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے تھے۔

۱۹۶۲ء میں میرا مجموعہ "زخم تمنا" چھپا تو میں نے انہیں بہ نفس نفیس پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں میرا تبادلہ گوہاٹی ہو گیا۔ اسی سال اگست میں ہم لوگوں نے حمیدہ سلطان، فخرالدین علی احمد، عابدہ احمد اور دیو کانت بروا کے تعاون سے آسام میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی۔ گوہاٹی اور شیلانگ میں تاریخی نوعیت کے دو مشاعرے کئے۔ پرویز صاحب کو مدعو کیا، لیکن اسی تاریخ کو اُن کی یونی ورسٹی میں بھی کوئی جلسہ یا مشاعرہ تھا، اس لئے وہ تشریف نہ لا سکے۔ نومبر ۱۹۶۳ء میں یوم بہادر شاہ ظفر کے موقع پر منعقدہ لال قلعے کے مشاعرے میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے کا افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی ایک خصوصی نشست حمیدہ سلطان نے بلائی تھی جس میں روش صدیقی، پرویز صاحب اور میں مدعو تھے۔ اس رات کا کھانا بھی حمیدہ آپا کے یہاں تھا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں فخرالدین علی احمد (آپا کا بھائی) اور دیو کانت بروا بھی دہلی آئے ہوئے تھے اور حمیدہ آپا کے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ میں نے پرویز صاحب کو دونوں سے ملوایا۔ پرویز صاحب جس بات سے خوش ہوئے وہ یہ تھی کہ اُن دونوں میں وزیروں جیسی کوئی بات نہیں تھی، اور شکر کیا کہ میں آسام جا کر غلط صحبت میں نہیں پڑ گیا تھا۔

یہ پرویز صاحب سے آخری ملاقات تھی۔

میں ۱۹۶۴ء کے اگست میں اپنے شعبے کے ایک امتحان کے سلسلے میں گوہاٹی سے کلکتے گیا۔ صرف تین دنوں کی بہ مشکل فرصت ملی تھی۔ آمد و رفت کا لمبا سفر بھی اسی میں شامل تھا۔ اس امتحان میں کامیابی پر مستقبل کے Career کا انحصار تھا۔ میں ناکامی کے اندیشوں سے ذہنی طور پر

بے حد اُلجھا ہوا تھا۔ اُس کے باوجود پرویز صاحب سے ملنے کا پروگرام طے تھا۔ کلکتہ آکر اُن سے ملے بغیر چلے جانے کا کوئی تصوّر میں کر ہی نہیں سکتا تھا، لیکن کچھ ایسی مجبوریاں حائل ہوگئیں کہ میں جائے قیام سے پارک سرکس جانے اور وہاں سے واپس آنے کا وقت نہ نکال سکا اور مایوس و نامُراد گوہاٹی لوٹ آیا۔ میں نے اپنے افسوس کا اظہار خط لکھ کر کیا۔ پرویز صاحب کا جواب بھی آیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ میرے عذرِ گناہ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں اپنی ملازمت اور خانگی مصروفیات میں اُلجھا رہا۔ وطن ایک دوبار آیا، لیکن کلکتہ جانے کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ اکتوبر ۶۷ء میں تبدیل ہوکر پٹنہ آیا۔ ارادہ تھا کہ ذرا وہاں کے حالات درست کرلوں تو کلکتہ جاؤں اور کسی میکدے میں پرویز صاحب کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر اُن سے اُسی طرح کی باتیں کروں جن کے لئے برسوں سے ترس گیا ہوں۔ لیکن ۵ مئی ۶۸ء کو وہ دنیا کے مے خانے سے اچانک اُٹھ کر چلے گئے اور اپنے ساتھ لُطفِ مے کشی بھی لیتے گئے۔

کلکتہ میں میری شہرت اور مقبولیت سے حسد کرنے والا ایک حلقہ سرگرم تھا۔ میں نے کلکتہ ہی میں ایک شعر کہا تھا:

دُشمنو! کچھ مری رُسوائی کا سامان کرو
دوستوں کو مری شہرت بھی گراں گذری ہے

میں جب تک کلکتہ میں رہا، یہ حلقہ اندر ہی اندر کھولتا رہا، لیکن جب میں وہاں سے رخصت ہوگیا تو اُس نے منصوبہ بند طریقے پر پرویز صاحب کو ہی نہیں، سالک لکھنوی اور ابراہیم ہوشؔ کو بھی مجھ سے بدظن کرنے کی سازشیں کیں، اور میرا خیال ہے کہ اس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پرویز صاحب Extrovert تھے۔ اور ایسا شخص "بہ آوازِ بلند" بھی سوچتا ہے۔ لوگ اس کو غلط معنی پہنا لیتے ہیں۔ پرویز صاحب اتنے سادہ دل تھے کہ انہیں بدگمان یا مشتعل کرنا نہایت آسان تھا۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے وابستہ ہونے کے بعد پرویز صاحب کے شاگردوں کا حلقہ فطری طور پر بڑھ گیا تھا اور قیاس ہے کہ ان میں سے کچھ خود کو پرویز صاحب

سے زیادہ قریب کرنے کی کوشش میں، دوسروں کی کردار کُشی کو جائز سمجھتے ہوں گے۔ کلکتہ اور ہوڑہ کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ جو ۶۲-۱۹۶۳ء تک پرویز صاحب سے قربت محسوس کرتا تھا، اُن سے آہستہ آہستہ بدظن ہونے لگا۔ پھر کئی طرح کی باتیں سننے میں آئیں ــــ کمیونسٹ پارٹی کے بدلتے ہوئے رویّوں سے تنگ آکر وہ کمیونزم سے ہی برگشتہ ہو رہے ہیں، مذہب کی جانب جھک رہے ہیں! اپنے پُرانے دوستوں اور ارادت مندوں سے بے تعلق ہو گئے ہیں، بہت Frustrated ہیں، مسلسل تنفس کی شکایت رہتی ہے۔ غلط لوگوں کی پذیرائی کرتے ہیں، وغیرہ۔

پرویز شاہدی شاعری میں استادی شاگردی کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان میں اتنا Patience تھا ہی نہیں کہ وہ بیٹھ کر باقاعدہ کسی کے کلام پر اصلاح دیں۔ اگر کہیں سے کوئی کلام بھیج دیتا، یا اُن کے پاس دے جاتا تو میرے حوالے کر دیتے کہ اسے دیکھ لیجئے۔ بعد میں یہ سُن کر مجھے حیرت ہوئی کہ اب انہوں نے باقاعدہ شاگرد بنا لئے ہیں، اور اُن کے ساتھ صبر سے بیٹھ کر محنت کرتے ہیں۔

پرویز صاحب کی زندگی کے آخری ساڑھے چار سال کا کوئی رُوپ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ بس سُنا ہے، اور کچھ باتیں ایسی بھی سُنی ہیں کہ اُن پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سُنا ہے "تثلیثِ حیات" کا سارا کام ان کی زندگی میں ہو چکا تھا۔ انہیں شاید اپنی نظم "روایتِ آدم" پسند تھی، اس لئے مجموعے میں شامل تو کی، مگر یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ کس موقع پر لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں ایک جگہ مخاطب کا نام "منظہر" آیا ہے۔ لیکن ایک عام قاری کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ 'منظہر'، کون ہے۔

پرویز صاحب اکثر قادر الکلام شاعروں کی طرح بے تکلفی سے ہزل یا فحش کلام لکھنے پر بھی قادر تھے۔ ایسا کچھ کلام میرے پاس محفوظ ہے، لیکن ان کی اشاعت مناسب نہیں، البتہ چند نسبتاً "بے ضرر"، سے اشعار پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی

صاحب نے پرویزصاحب کے سامنے مجھ سے پوچھا : "آپ کی شادی ہو چکی ہے ؟"

پرویز صاحب نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر برجستہ کہا : "نہیں یہ دستِ خود دہانِ خود کے قائل ہیں ۔"

اور اس کے بعد ہی انہوں نے گیارہ اشعار کی ایک غزل لکھی ، جس کے تین اشعار حاضر ہیں ۔ باقی اشعار تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کے تحت قابلِ سزا ہو سکتے ہیں :

حُسنِ معنی ہاتھ میں ہے ، حُسن صورت ہاتھ میں
دست کاری کے تصدق ، ہے حقیقت ہاتھ میں

دست کارانِ محبّت کی گُہر باری نہ پوچھ
ہر خزانہ ہاتھ میں ہے ، ساری دولت ہاتھ میں

ہے نظامِ دست کاری میں بڑی آسودگی
اپنی دولت ہاتھ میں ، اپنی مشقت ہاتھ میں

پرویز صاحب جیسا حاضر جواب میں نے بہت کم دیکھا ہے ۔ مجازؔ کو اس سلسلے میں بڑی مقبولیت ملی ، لیکن ایک بار مجازؔ کو بھی پرویز صاحب نے لاجواب کر دیا تھا ۔ افسوس ہے کہ وہ اشعار صفحۂ قرطاس پر نہیں لا سکتا ۔

کلکتہ کے ماہنامہ 'جدید اُردو' کی ادارت پرویز صاحب کے ذمّے تھی ۔ اس رسالے کے مالک جلیل صاحب ثقہ ہونے کے باوجود پرویز صاحب کے بڑے بے تکلّف دوست تھے ۔ ایک دفعہ جلیل صاحب نے اپنے خیال میں بڑا تیر مارا ۔ بولے :

"پرویز ! جیسے تم عیّاش ہو ، ویسے تمہارے والد بھی عیّاش تھے ۔"

پرویز صاحب نے فوراً جواب دیا : "بالکل صحیح ہے ، میرے دادا بھی عیّاش تھے ۔ البتہ تمہارے والد اتنے نیک اور صالح بزرگ تھے کہ انہوں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ تک نہیں لگایا ۔"

جلیل صاحب کے لئے گالیاں بکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

سجاد ظہیر جب پاکستان کی جیل سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے ادیبوں کا ایک جلسہ مئو (اعظم گڈھ) میں منعقد کرایا۔ اس جلسے میں فراق گورکھپوری نے تقریر کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا کہ اعلیٰ شاعری Inspired nonsense کا نام ہے۔ اپنی دلیل کے ثبوت میں انہوں نے انگریزی، اردو اور فارسی شاعری سے حوالے بھی دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ہی ایک مصرع پیش کرتے ہوئے کہا کہ اب اسی کے کیا معنی ہیں؟ ؎

سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں۔

پرویز صاحب برجستہ بول پڑے: "جی ہاں، یہ تو بے معنی ہے"۔

بغل میں بیٹھے ہوئے احتشام حسین بھی مسکرانے لگے۔

پرویز صاحب دوسروں کی حاضر جوابی کی داد بھی بڑی فراخ دلی سے دیتے، اور پیار بھری گالیوں سے کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوتے، کیوں کہ "بے مزہ" ہونا وہ "رقیبوں" کا مقدر سمجھتے تھے۔ میں نے گذشتہ صفحات میں ایک flirt خاتون کا ذکر کیا ہے، جن کے یہاں تقریباً ہر شام پرویز صاحب حاضری دیا کرتے۔ ایک دن وہ بڑے خوش خوش اسکول آئے۔ چہرہ کھلا پڑتا تھا۔ آتے ہی مجھے خوش خبری سنائی: کل شام میں "کامیاب" ہو گیا۔ پھر ہنستے ہوئے اور لطف لیتے ہوئے بولے "مرحلۂ شوق طے ہونے کے بعد انہوں نے کہا: "You swine!"

پرویز صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں ہونے والی بحثوں میں برابر حصہ لیا کرتے تھے، لیکن کچھ "دوستوں" کا خیال تھا کہ پرویز صاحب نہ تقریر کر سکتے ہیں، نہ نثر لکھ سکتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو شاید میرا ظرف آزمانے کے لئے مجھ سے

بھی کہا تھا : "آپ کتنی اچھی نثر لکھتے ہیں، پرویز صاحب کو اس سے کیا علاقہ؟" ـــــــ عموماً ہماری رائیں ہماری ہی ناواقفیت کا ڈھول پیٹتی نظر آتی ہیں۔ پرویز صاحب کو میں نے کٹک میں صرف کلام سُنانے کے لئے نہیں، بلکہ جگر مرادآبادی کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے بھی بُلایا تھا۔ پرویز صاحب نے اس موقع پر اتنی اچھی، اتنی رواں، اتنی بلیغ تقریر کی کہ میں حیرت سے اُن کا مُنہ تکتا رہ گیا ـــــــ پھر "تثلیث حیات" میں اُن کا دیباچہ اُن کی خوبصورت اور دل نواز نثر کا آپ ہی اعلان کر رہا ہے۔ وہ تحریر اور تقریر دونوں پر قادر تھے۔

میں جب ۱۹۵۱ء میں کلکتہ پہنچا تھا تو بہت دل برداشتہ اور دل شکستہ تھا، زندگی سے مستقل بیزاری تھی اور میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ ایسے وقت میں کلکتہ کی جن دو شخصیتوں نے مجھے غیر شعوری طور پر حوصلہ دیا، اپنے آپ پر اعتماد کرنا سکھایا، زندگی کے لطیف پہلوؤں سے آشنا کرایا اور میری شخصیت کی تعمیر میں مدد دی، ان میں ایک نام پرویز شاہدی کا ہے۔ دوسری شخصیت کا ذکر، میں فی الحال نہیں کروں گا۔ ابھی پہلی شخصیت ہی کا قرض کہاں چکا سکا ہوں!

● ۱۹۷۹ء

کرشن چندر

کرشن چندر! — زباں پہ بار خدایا..... کہ اس نام کے آتے ہی میری نطق نے میری زبان کے بوسے لئے، لیکن کبھی آپ نے سوچا ہے کہ کرشن چندر کی تحریر کا ہر جملہ، ہر فقرہ، ہر لفظ ہم سے بوسے کا طالب ہوتا ہے! کرشن چندر — جو زبان کا شاعر اور بیان کا ساحر تھا! جب ہمارے یہاں جدیدیت کا غلغلہ بلند ہوا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پیش رَو ترقی پسند ادبی تحریک کو مطعون اور اس کے علمبرداروں کو رَد کیا جائے۔ اس تحریک سے وابستہ سب سے ہر دلعزیز یا کم از کم زیرِ بحث نام کرشن چندر کا تھا، لہٰذا اُنہیں ادیب کے زُمرے سے ہی خارج کر دیا گیا اور وہ "non - writer" کہلائے۔ ان دنوں یہ بات بہت پھیلائی گئی کہ جب کرشن چندر کے ادبی انحطاط پر بلراج مین را نے مہندر ناتھ کے سامنے تنقید کی تو مؤخر الذکر نے اوّل الذکر کو زدوکوب کیا۔

ایک زمانہ تھا جب یہی "non - writer" اردو افسانے کا بے تاج بادشاہ تھا، اور اس کے تمام ہم عصروں کی کو، اُس سے دبتی تھی۔ سب اُس سے حسد

کرتے تھے، اس کے مقابل آنا چاہتے تھے۔ کچھ اس کے قریب کی صف میں جگہ پاکر مطمئن تھے۔ اُردو افسانے کے عناصر اربعہ بالترتیب کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت قرار دیے گئے تھے۔ ایک بار منٹو کو احمد ندیم قاسمی کا (جو ان دنوں "ادب لطیف" کے اڈیٹر بھی تھے) ایک تعریفی خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ آپ افسانہ نگاری کے "بادشاہ" ہیں۔ منٹو نے یہ خط فخر سے کرشن چندر کو دکھایا۔ اتفاق سے کرشن چندر کے پاس بھی احمد ندیم قاسمی کا ایک خط اُنہیں دنوں ملا تھا، جسے انہوں نے بے نیازی سے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ منٹو نے فخر کا اظہار کیا تو کرشن چندر نے انہیں وہ خط دکھا دیا جس میں لکھا تھا کہ آپ افسانہ نگاری کے "شہنشاہ" ہیں۔

شروع سے ہی کرشن چندر کا قد دوسرے افسانہ نگاروں سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء تک ان کا طوطی بولنے لگا تھا۔ راشد نے ۱۹۴۱ء میں اپنے مجموعہ کلام "ماورا" پر ان سے دیباچہ لکھوایا۔ سہیل عظیم آبادی نے "الاؤ" پر ۱۹۴۲ء میں۔ ۴۳-۱۹۴۲ء سے ۵۱-۱۹۵۰ء تک، جب میرا شوق مطالعہ عروج پر تھا، کرشن چندر کی ہر تحریر میری آنکھوں کا سرمہ تھی۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "طلسم خیال"، "نظارے"، "زندگی کے موڑ پر"، "ان داتا" "نغمے کی موت"، "پرانے خدا"، انشائیوں یا مزاحیہ طنزیہ مضامین کے مجموعے "ہوائی قلعے" اور "گھونگھٹ میں گوری جلے"، ڈراموں کا مجموعہ "دروازہ" ان کے مرتب کیے ہوئے مجموعے "نئے زاویے" کی دونوں جلدیں، اور اپندر ناتھ اشک کے منتخب افسانوں کا مجموعہ "قفس" — میرا خیال ہے کہ سب ۱۹۴۵ء کے اوائل تک چھپ چکے تھے۔ میں نے یہ تمام کتابیں نہ صرف پڑھیں بلکہ انہیں حرزِ جاں بنایا۔

کرشن چندر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے، ۱۹۴۰ء میں لاہور سے دہلی آ گئے، وہاں ان کے رفیقوں میں راشد، منٹو، اشک، میراجی وغیرہ تھے۔ میں جب ۱۹۵۸ء میں آل انڈیا ریڈیو میں آیا تو مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ اس ادارے سے پطرس، کرشن چندر اور یہ دوسرے بڑے ادیب وابستہ رہ چکے ہیں۔

کرشن چندر ۴۲ء میں شالیمار پکچرز پونا کے مالک ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد کی دعوت پر ریڈیو سے فلمی دنیا میں آ گئے اور اس ادارے سے بحیثیت مکالمہ نگار وابستہ ہو گئے۔ یہیں جوش بھی تھے، ساغر نظامی بھی۔ پھر نئے شاعروں اور ادیبوں میں اختر الایمان اور راما نند ساگر بھی وہیں آ گئے۔ ایک مسعود پرویز تھے جن کی نظمیں ان دنوں "ادب لطیف" وغیرہ میں چھپا کرتی تھیں، لیکن وہ شالیمار کی فلموں میں ہیرو بن کر آئے۔ اس ادارے کی خاص ہیروئن "پراسرار نینا" کہلاتی تھیں۔ ان کا اصل نام شاہدہ تھا۔ علی گڈھ سے تعلق تھا۔ ان کے شوہر محسن عبداللہ تھے جو بمبئی ٹاکیز میں "کہانی اور مکالمہ نویسی کے شعبے" سے وابستہ تھے۔ وہ علی گڈھ کی مشہور روشن خیال شخصیت شیخ عبداللہ کے صاحبزادے اور ڈاکٹر رشید جہاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی ایک بہن خورشید جہاں فلموں میں رینو کا دیوی کے نام سے کام کرتی تھیں۔ ان کی دوسری فلم بمبئی ٹاکیز کی "نیا سنسار" تھی۔ اتفاق سے بحیثیت فلمی کہانی کار یہ خواجہ احمد عباس کی پہلی فلم تھی، جس کے لئے انہیں ساڑھے سات سو روپے ملے تھے۔ رینو کا دیوی نے شالیمار کی فلم "غلامی" میں بھی کام کیا تھا۔ ان کے مقابل مسعود پرویز ہیرو تھے۔ "پراسرار نینا" محسن عبداللہ سے علیحدہ ہو گئیں اور انہوں نے ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد سے شادی کر لی، جو شالیمار کا دیوالہ کر کے اپنی نئی بیوی کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ رینو کا دیوی شادی کے بعد پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں بیگم خورشید مرزا کے نام سے کام کرتی رہیں۔ گذشتہ دنوں ان کا انتقال ہو گیا۔

کرشن چندر کے بارے میں ان دنوں بھی میرا خیال یہی تھا کہ وہ فلموں میں کامیاب نہیں ہیں۔ "من کی جیت" اور "غلامی" کے مکالموں سے مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ شالیمار کے حالات خراب ہوئے تو کرشن چندر بمبئی چلے آئے، اور پھر خود بھی فلم سازی کی طرف مائل ہوئے اور دو فلمیں "سرائے کے باہر" اور "دل کی آواز" بنائیں۔ دونوں ناکام ہوئیں۔ تیسری فلم "راکھ" آدھی بن پائی تھی کہ فلم کمپنی ہی ٹوٹ گئی۔ اپنی ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں انہوں نے "سرائے کے باہر" نام کا ڈرامہ لکھا اور پیش کیا تھا جو ریڈیو کے سامعین میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ ان کے مجموعے "دروازہ" میں شامل ہے۔ فلم کی ضرورت کے پیش نظر اس میں بہت کچھ اضافہ

کرنا پڑا۔ پھر وہ شاید بھول گئے کہ ریڈیو اور فلم دو الگ الگ میڈیم ہیں اور ان دونوں کے مطالبات مختلف ہیں۔ ریڈیو آواز کا میڈیم ہے، اس لئے مکالموں کی صناعانہ اور شاعرانہ زبان سننے والوں کو اچھی لگ سکتی ہے، لیکن فلم میں آواز کے علاوہ حرکات وسکنات اور کرداروں کے عمل کی بھی اہمیت ہے۔ یہاں طول طویل پُر تصنّع مکالمے کام نہیں آتے۔ فلم بُری طرح فلاپ ہوئی۔ میں نے انہیں دنوں اس پر ایک طویل سخت تبصرہ کیا تھا، جو میرے مضامین کے مجموعے "آتی جاتی لہریں" میں بھی شامل ہے۔ "سرائے کے باہر" کی ناکامی کا ایک سبب اس کی ہیروئن رادھیکا بھی تھی، جس کا اصل نام ثمینہ تھا۔ وہ شالیمار میں اداکارہ کی حیثیت سے قسمت آزمانے آئی تھی۔ کرشن چندر سے قربت پیدا ہوئی اور انہوں نے اسے ہیروئن بنانے کا وعدہ کرلیا۔ ثمینہ سے اپنے اور کرشن چندر کے تعلقات پر راما نند ساگر نے ایک افسانہ "میرا ہمدم، میرا دوست" کے نام سے اپریل ۱۹۴۶ء کے "ساقی" میں لکھا تھا۔ اس افسانے کے کرداروں کو پہچاننا ان کے لئے زیادہ مشکل نہیں جو شالیمار پکچرز سے وابستہ افراد سے تھوڑی واقفیت بھی رکھتے ہوں۔ کرشن چندر کو کرن چندر کے روپ میں کون نہ پہچانے گا؟ اپنا نام البتہ انہوں نے اچھا خاصہ بدل دیا تھا، یعنی راجن۔ کئی نام اپنی اصل صورت میں تھے، مثلاً — شیام، اختر (اختر الایمان)، پرویز (مسعود پرویز)، ویاس (بھرت ویاس)۔ ایک جگہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ یہاں ہندوستان کا عظیم شاعر ہوش نصیح آبادی رہتا ہے، یعنی جوش ملیح آبادی۔

راما نند ساگر کا یہ افسانہ اس "حمام" کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں سب ایک جیسے تھے — مصنف خود بھی۔ اس افسانے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ثمینہ راما نند ساگر کی طرف راغب تھی، مگر کامیابی ان کے ظاہری دوست اور باطنی رقیب کرشن چندر کے حصے میں آئی۔ چند لفظوں میں کرشن چندر کے کردار کے پہلو کو اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے اپنے جذبۂ رشک وحسد کی عینک لگا کر یہ تصویر بنائی ہے:

"ایک پختہ ریاکار کی طرح اس میں غرور کی بو تک نہ تھی، اور ہر ایک سے ہمدردی تو گویا اس کا شیوہ تھا، حتّٰی کہ وہ ہر ایک کا رازدار تھا، ہر ایک

کا ہمدم، ہر ایک کا دوست۔"

اس افسانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا قیام کرشن چندر کے یہاں تھا۔ کرشن کی بیوی افسانہ نگار کو پسند نہ کرتی تھی۔ یہ بات تو خیر اب ہر ایک کو معلوم ہے کہ کرشن چندر اپنی بیوی سے ہمیشہ نامطمئن اور ناآسودہ رہے۔ ان کی صورت اور مزاج دونوں کی وجہ سے۔ اس کی تصدیق افسانے کے ان جملوں سے ہوتی ہے، اور ان سے کرشن چندر کی قوت برداشت کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

"بیوی اس کی زندگی کا وہ ناسور تھا، جو کسی بھی عمل جراحی سے کاٹا نہ جاسکتا تھا۔ با ایں ہمہ اسی کم ظرف بیوی کی خاطر اس نے اپنی محبوبہ کو اس وقت جب کہ وہ اس کی خاطر اپنے خاوند کو طلاق دے کر دلی سے کولہا پور تک آگئی تھی، اپنے نوکر کے ہاتھ یہ جواب لکھ بھیجا تھا: 'میں نے کیچڑ ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے'۔"

کرشن چندر، ثمینہ کے بارے میں (جس سے ان کے گہرے مراسم قائم ہوئے اور جو اُن کی فلم کی ہیروئن بنی) جو رائے رکھتے تھے، یا راما نند ساگر کو اس سے بدگمان کرنے کے لئے جس رائے کا اظہار کرتے تھے، اسے زیر گفتگو افسانے میں کرشن چندر کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے:

"یہ لڑکی جس کی معصومیت پر تم فدا ہو رہے ہو، اس سے پہلے جانے کتنوں پر ہاتھ صاف کرچکی ہے ... اب بھی گھومنے پھرنے کے لئے ایک نواب صاحب کی موٹر کار اس کی سواری میں رہتی ہے۔ اس کا چہرہ خوبصورت نہ سہی، لیکن طفلانہ معصومیت کا ایک ایسا پرتو اس پر موجود ہے کہ تم جیسے کئی نوجوان عشق کے جھولنے میں زندگی تباہ کرچکے ہیں۔"

راما نند ساگر کے افسانے میں ثمینہ کا نام امینہ ہے۔

فروری ۱۹۴۹ء میں ریلوے اسٹرائک کے خطرے کے پیش نظر مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ میرے ساتھ منظر شہاب بھی گرفتار ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے ایک ترقی پسند رسالے "نئی کرن" کا اجرا کیا تھا۔ اس کے پرچے بھی پولیس اٹھا کرلے گئی تھی۔ انہیں دنوں کچھ اور ادیبوں اور شاعروں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی تھی، مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی کی۔ سردار جعفری شاید پہلے ہی سے جیل میں تھے۔ بمبئی میں ان گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ ملک راج آنند، ساغر نظامی وغیرہ نے بھی تقریریں کی تھیں۔ کرشن چندر نے اپنے خطبہ صدارت میں گرفتار شدگان کا نام لیتے ہوئے "بہار کے لیکھک ایم۔ امام" کا نام بھی لیا تھا۔ اس وقت تک ایم۔ امام کے نام سے میری کچھ چیزیں چھپی ضرور تھیں، لیکن کسی اہم رسالے میں نہیں۔ "نئی کرن" کے ادارہ میں بھی یہی نام تھا۔ اس وقت کے سب سے بڑے ادیب نے مجھ جیسے نوعمر لکھنے والے کا نام اپنے ایک مضمون میں لیا، اس سے بڑھ کر افتخار کی بات میرے لئے اور کیا ہو سکتی تھی!

کرشن چندر کو میں نے "نئی کرن" کا پہلا شمارہ بھجوایا تو تھا، مگر احساس شرمندگی کے ساتھ، کیوں کہ اس شمارے کا معیار حسب خواہ نہ تھا۔ دوسرے اس میں ان کی فلم "سرائے کے باہر" پر میرا ایک سخت جارحانہ تبصرہ بھی شامل تھا۔ کرشن چندر کی جانب سے کوئی رسید نہیں آئی تو میں نے انہیں یاد دہانی کا خط لکھا۔ انہوں نے اپنی مصروفیات کی تفصیل بتاتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا:

> "یہ سطریں بھی محض اس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ کہیں آپ میری خاموشی کا غلط مفہوم نہ نکال لیں۔"

"نئی کرن" کا دوسرا شمارہ میرے نزدیک بڑی حد تک اطمینان بخش تھا۔ اس کا اداریہ بھی بالواسطہ بھیمڑی کانفرنس کے منشور کی ہمنوائی کر رہا تھا۔ میں نے کرشن چندر کو "پیارے ساتھی" سے مخاطب کرتے ہوئے ان سے افسانے کی درخواست کی۔ اُن دنوں اشتراکیت اور ترقی پسندی سے وابستہ ہم لوگ ایک دوسرے کو "کامریڈ" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ آج کچھ عجیب سا احساس

ہوتا ہے کہ میں نے کرشن چندر جیسے بڑے ادیب کو بھی اسی طرح مخاطب کرنے کی جرأت کی تھی۔ شاید انتقاماً ہی کرشن چندر نے بھی مجھے خط میں "پیارے ساتھی" سے مخاطب کیا اور یہ لکھا کہ پرچہ ابھی مجھے نہیں ملا، لیکن یقین ہے کہ آپ لوگوں نے محنت کی ہوگی۔ اس خط کے ساتھ انہوں نے اپنا ایک مضمون بہ عنوان "ایک امریکی ناول" بھیجا تھا، جو دراصل ہاورڈ فاسٹ کے مشہور ناول Road to Freedom کے اُردو ترجمے کا دیباچہ تھا۔ یہ ترجمہ احسن علی خاں نے کیا تھا۔ اس دوران کرشن چندر کو "نئی کرن" کا دوسرا شمارہ مل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں میری انتہا پسندی پسند آئے گی، کیوں کہ ان دنوں ترقی پسندی اسی راستے پر گامزن تھی، لیکن انہوں نے مجھے لکھا:

"ہمیں محدود دائرے سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہیے، تاکہ ہم صحت مند رہیں اور زیادہ دنوں جی سکیں۔"

یہ میرے لئے ایک تازیانہ تھا!

میں ستمبر ۱۹۵۱ء کے اواخر میں کلکتہ آ گیا، اور وہاں سات سال سے زیادہ میرا قیام رہا۔ اس دوران کرشن چندر دو بار کلکتے آئے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مرتبہ کلکتے آ چکے تھے۔ اپنے کالج کی تعلیم کے ابتدائی دنوں میں وہ دہشت گردوں کی ایک جماعت میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں دنوں ان کی ملاقات بھگت سنگھ سے ہوئی۔ خطرہ بڑھا تو چند ماہ کے لئے کلکتہ بھاگ گئے۔ دوسری بار وہ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کُل ہند کانفرنس میں پنجاب کے ترقی پسند مصنفین کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کے لئے کلکتہ گئے تھے۔ اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر اپنی نوبیاہتا بیوی رضیہ سجاد ظہیر کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور اس مرتبہ ان کی جگہ ڈاکٹر عبدالعلیم کو انجمن کا سکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔

کرشن چندر تیسری بار اپریل ۱۹۵۲ء میں کُل ہند امن کانفرنس میں شرکت کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور انہوں نے مجلسِ صدارت کے ایک رُکن کی حیثیت سے انگریزی میں

ایک خطبہ بھی پڑھا۔ کرشن چندر انگریزی کے ایم۔ اے تھے۔ شروع شروع میں وہ انگریزی میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے انگریزی کے دو تین جرائد کی ادارت بھی کی تھی۔ پھر وہ اردو کے ہو کر رہ گئے، لیکن کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے انگریزی میں بھی لکھتے رہتے۔ جن دنوں ادب کے علاوہ فلموں سے بھی میری دلچسپی عروج پر تھی، کرشن چندر کے مضامین اور خود ان کے کئے ہوئے اپنے افسانوں کے ترجمے عموماً ماہ نامہ "ساونڈ" (SOUND) میں نظر آتے۔ اس کے اڈیٹر ظہیر بابر قریشی تھے، جو ZABAK کے نام سے مشہور تھے۔ "ساونڈ" کی ہر دلعزیزی کا زمانہ ۴۳ء اور ۴۷ء کے درمیان ہے۔ اس کے خاص مضمون نگار خواجہ احمد عباس بھی تھے۔

کرشن چندر کی انگریزی عبارت میں سادگی اور صفائی کے ساتھ شاعرانہ چاشنی بھی شامل تھی۔

۵۲ء کی کل ہند امن کانفرنس ایک تاریخی کانفرنس تھی، اور ہر چند کلکتہ جلسوں اور جلوسوں کا شہر ہے، لیکن اس کانفرنس کی نوعیت اپنی ایک منفرد اور جداگانہ شان رکھتی تھی۔ کئی نامور شخصیتوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں براہ راست حصہ لیا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ملک راج آنند، ہیرن[1] مکرجی، گوپال[2] ہلدار، کرشن چندر، مجاز، سردار جعفری، پرویز شاہدی، مخدوم محی الدین، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، نیاز حیدر، وامق جونپوری، اشک امرتسری، خواجہ احمد عباس، انور عظیم، پرکاش پنڈت، رضیہ سجاد ظہیر، سید عبد المالک[3]، پرتھوی راج کپور، سلیل چودھری[4]، سریندر کور[5]، اچلا سچدیو[6]، امر شیخ[7]، رام کمار[8] اور بہت سے ادیب، شاعر، دانش ور، فن کار۔

اس کانفرنس کی بہت سی باتیں ذہن سے محو نہیں ہوتیں۔ کسی سب کمیٹی کے اجلاس میں اسرار الحق مجاز نے بھی انگریزی میں ایک تقریر کی۔ ان دنوں اُن پر جنون کا حملہ تھا، نہ جانے انھوں نے کیا کچھ کہا۔ وہ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد باہر آئے تو میں نے ان سے کہا:

---

[1] بنگلہ زبان و ادب کے عالم اور نقاد [2] بنگلہ ادیب اور نقاد [3] آسامی زبان کے بلند پایہ افسانہ نگار [4] ہندوستانی عوامی تھیٹر کے موسیقار، اب فلمی دنیا کے نامور میوزک ڈائرکٹر [5] مشہور مغنیہ [6] فلمی اداکارہ [7] مرہٹی عوامی مغنی [8] معروف آرٹسٹ

"مجازؔ صاحب! سنا ہے آپ نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔"
مجازؔ نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: "آپ نے نہیں سُنی؟"
"معاف کیجئے میں ذرا دیر سے پہنچا۔"
"Then I must commit suicide!" (تب تو مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے!")۔ مجازؔ کی طبعی حسِ ظرافت جاگی ہوئی تھی۔ اُنھیں پتہ نہیں تھا کہ انھوں نے قسطوں میں کب سے "خودکشی" شروع کر رکھی ہے۔

اسی وقت سردار جعفری بھی آ گئے اور چٹخارے لے لے کر مجازؔ کی تعریف کرنے لگے:
"تم نے بڑی کھری کھری باتیں کہیں، سچ ہے۔ اللہ کے بندوں کو آتی نہیں رُوباہی!"
مجازؔ کی رگِ ظرافت پھر پھڑکی: "رُوباہی تخلّص ہے کیا؟"
سردار جعفری نے اس وار کی چوٹ محسوس کی اور مسکراتے ہوئے وہاں سے چل دیئے۔
مجازؔ نے پیچھے سے داغا: "آداب عرض ہے!"

اس کانفرنس کے ساتھ ہی ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ کلکتہ کی تاریخ میں شاید اتنا شاندار مشاعرہ کبھی نہیں ہوا۔ لگ بھگ بیس پچیس ہزار سامعین تھے۔ کرشن چندر نے صدارت کی تھی۔ فیضؔ اور سجادؔ ظہیر پاکستان کی جیلوں میں بند تھے۔ اس مشاعرے میں فیضؔ کی غزل مجروحؔ نے اور سجادؔ ظہیر کی وامقؔ نے اپنے اپنے مخصوص ترنم میں سنائی تھی۔ اس مشاعرے کے کامیاب ترین شعرا کیفی اعظمی، پرویز شاہدی اور نیاز حیدر تھے۔ اسی مشاعرہ کا واقعہ ہے کہ جب مجازؔ مائک پر آئے تو انہوں نے اپنا کلام سنانے سے پہلے کہا: "میرے دوست کرشن چندر نے فرمائش کی ہے کہ میں PEACE پر کوئی نظم پڑھوں، تو میں اپنا کلام CUT-PIECE (کٹ پیس) میں سنا رہا ہوں۔" اور اس کے بعد انھوں نے کچھ متفرق اشعار اور قطعات سنائے جن میں سے ایک یہ تھا:

نطقِ رُسوا، دہن دریدہ ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے، دیدہ ہے

رندِ برباد کو نصیحت ہے　　　　شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

اُن دنوں مجاز، شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی سے بہت برہم نظر آتے تھے۔ کچھ ہی دنوں پہلے جوش نے ایک طویل نظم مجاز کی نصیحت میں لکھی تھی اور کم و بیش ان ہی دنوں ان کی ایک نظم شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم جموں کشمیر کی ستایش میں شائع ہوئی تھی۔ مجاز نے اپنا یہ شعر بھی پڑھا تھا:

سینۂ انقلاب چھلنی ہے　　　　شاعرِ انقلاب کیا جانے!

اس مشاعرہ کا ایک المیہ پہلو یہ ہے کہ جب مجاز نے اپنی معرکہ آرا نظم "اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو" پڑھنی شروع کی تو مجمع نے، جو انقلابی اور ہنگامہ خیز نظمیں سننے کا مشتاق تھا، بے طرح شور مچایا اور مجاز تین بند پڑھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے یاد ہے جب وہ اس مصرعے پر پہنچے تھے ع شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا، تو انھوں نے بطورِ وضاحت بڑی نفرت، حقارت اور غصّے سے کہا تھا: "Those I.C.S. Bureaucrats!"

سردار جعفری نے، جو مشاعرہ کے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، معاملہ پر قابو پانے کی کوشش کی اور سامعین سے کہا کہ یہ نظم گزشتہ پچیس سال میں لکھی ہوئی بہترین نظموں میں سے ایک ہے، آپ اسے غور سے سنیں، مگر مجاز دوبارہ پڑھنے پر رضامند نہ ہوئے۔ مجروح نے مائک پر آکر غیر سنجیدہ لہجے میں مجاز سے درخواست کی کہ وہ اپنی کوئی غزل سنادیں، لیکن مجاز جو تن کر بیٹھے تھے، تنے رہے۔ ان کی شاعرانہ خودداری نے انھیں دوبارہ مائک پر آنے سے باز رکھا۔

مجھے آٹوگراف حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ لیکن میرے ایک دوست سید منسوب حسن نے مجھے آگے بڑھادیا تو مجھے ان کی آٹوگراف بک میں کچھ دستخط لینے پڑے۔ سیف الدین کچلو کے پاس حاضر ہوا تو انھوں نے ایک بار میرے لمبے قد کا جائزہ لیا اور دستخط کرنے سے پہلے میری طرف دیکھ کر شفقت سے کہا: "You tall boy!"۔ کرشن چندر کے پاس

گیا تو انھوں نے دریافت کیا: "انگریزی میں یا اردو میں؟" میں نے کہا: "اردو میں۔" انہوں نے اردو میں دستخط کر دیئے تو میں نے دوسرا صفحہ بڑھا دیا: "اس پر انگریزی میں۔" وہ مسکرائے اور خاموشی سے فرمائش کی تعمیل کر دی۔

مارچ ۵۳ئہ میں دہلی میں ایک بار پھر کرشن چندر سے ملاقات ہوگئی، جب میں کُل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کانفرنس میں کلکتہ کی انجمن کے ایک مندوب کی حیثیت سے شریک ہوا۔ یہ ترقی پسند ادبی تحریک کا سخت بحرانی دور تھا اور اس کا اندازہ ان تقریروں سے ہو جاتا تھا جو اس کانفرنس میں ہوتی تھیں اور ان کا دفاع رام بلاس شرما، ڈاکٹر عبدالعلیم اور سردار جعفری کرتے رہتے تھے۔ کرشن چندر تقریر کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بولتے تو جھجکتے ہوئے۔ انہوں نے تقریر کیا کی، افسانوی انداز میں کچھ باتیں کیں۔ رام بلاس شرما سکرٹری تھے اور ان کے خلاف محاذ آرائی تھی۔ اس لئے کرشن چندر کا نام پیش ہوا۔ ترقی پسندوں کے انتہا پسند حلقے سے وابستگی کی بنا پر کرشن چندر سے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ کلکتہ کی انجمن کے ہی ایک مندوب شری نرائن جھا نے کرشن چندر کے نام کی مخالفت کی تھی اور وجہ بھی بتانی چاہی تھی۔ لیکن یہ کہہ کر انہیں روک دیا گیا کہ آپ دوسرا نام پیش کیجئے۔ بہر حال کرشن چندر سکرٹری چُنے گئے۔

اس کانفرنس کے موقع کی کچھ باتیں یاد آرہی ہیں۔ ساحر لدھیانوی، جنھیں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، بمبئی سے آئے تھے۔ ہم لوگ پاس کے ایک چائے خانے میں بیٹھے۔ ذکر فلمی دنیا کا آیا تو وہ اس زمانے کی بعض بڑی ہیروئنوں کا مذاق اُڑانے لگے کہ ان سے ثانی کے علاوہ اور کسی موضوع پر بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر پرکاش پنڈت سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "بھئی مجاز کو انجکشن وکشن دلوا کر اس کی شادی کرا دو۔" (آج میں سوچتا ہوں کہ ساحر نے خود انجکشن وکشن لے کر شادی کیوں نہ کی!) کانفرنس میں نیا مینی فسٹو پیش ہونا تھا۔ ساحر کہنے لگے، بھئی بحث ہوگی، ڈرافٹ مینی فسٹو پڑھ کر تیاری کرنی چاہیے۔ ساحر نے بحث

میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ حصّہ کیا لیتے، وہ بحث کے دوران موجود ہی نہیں تھے۔ (شاید انہیں بھی اب "ٹافی" کے علاوہ کسی موضوع سے دلچسپی نہیں تھی۔)

اس کانفرنس میں گوپال متل شریک تو نہیں ہوئے لیکن وہ آس پاس گھومتے پھرتے یا لان میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ وہ امریکی امداد سے ترقی پسندوں کے خلاف ایک رسالہ نکالنے جا رہے ہیں۔ میں نے یہی بات ان سے دریافت کی۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ کہنے لگے کہ جو بھی ترقی پسندوں کی آمریت کے خلاف کچھ بولتا یا لکھتا ہے، اسے امریکی ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ دوسرے مہینے "تحریک" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آگیا۔ یہاں یہ بات بھی یاد آگئی کہ کانفرنس کے پہلے دن ہی اسٹالن کا انتقال ہوا تھا اور بعد کی کارروائی بڑے سوگوارانہ ماحول میں ہوئی تھی۔

۵۲ء کے بعد کرشن چندر ستمبر ۵۷ء میں کلکتہ آئے اور اس طرح آئے کہ چار چھ دن تک کلکتہ میں ان کی موجودگی کا کسی کو کانوں کان علم تک نہیں ہوا۔ وہ جنتا سنیما کے پاس میجسٹک ہوٹل کے کمرہ ۱۰۳ میں بند ہو کر روپ کے شوری کی ایک فلم کے لئے مکالمے اور منظر نامے لکھتے رہے۔ یہ فلم شاید کبھی مکمل نہ ہو پائی۔ کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ روپ۔ کے شوری کی مشہور فلم "ایک تھی لڑکی" کے مکالمے کرشن چندر نے ہی لکھے تھے اور اس فلم کی شہرت اور کامیابی میں مینا کی شوخی اور "لارا لپّا" والے گانے کا ہی نہیں بلکہ کرشن چندر کے مکالموں کا بھی حصہ تھا۔

ان دنوں کلکتہ کے ادبی سراغرساں شہزاد منظر تھے۔ انھوں نے یہ مژدہ سنایا کہ کرشن چندر کلکتہ میں ہیں۔ مزید تفصیلات کا انھیں بھی علم نہ تھا۔ دوسرے دن یعنی ۲۸ ستمبر کو سہ پہر کے روزنامہ "آبشار" میں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ کرشن چندر کے اعزاز میں کلکتہ کے ادیبوں کی طرف سے چورنگی ریستوراں میں چار بجے ایک ٹی پارٹی کا اہتمام ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان ادیبوں میں نہ پرویز شاہدی شامل تھے، نہ ل۔ احمد اکبر آبادی۔

قریباً دو بجے ابراہیم ہوشؔ کا ایک رقعہ مجھے ملا، جس میں اُنہوں نے لکھا تھا کہ تم بھی اس پارٹی میں مدعو ہو، دفتر "آبشار" آجاؤ، ہم لوگ سالکؔ صاحب کے ساتھ وہاں چلیں گے۔ میں وہاں جانے کو تیار ہی ہو رہا تھا کہ شہزاد منظر اور اصغر راہیؔ آگئے اور بولے کہ ہم لوگ ہوٹل جارہے ہیں، آپ بھی چلئے۔ ٹی پارٹی میں بغیر دعوت کے میرے احباب کا شرکت کرنا مجھے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوا۔ لیکن یہ احباب اتنے جوش میں تھے کہ مجھے اس جانب اشارہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ صرف اس رقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اتنا کہا کہ مجھے سالکؔ صاحب اور ہوشؔ صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ دونوں احباب دل برداشتہ ہوکر نیم خفگی کے عالم میں چلے گئے بعد میں اصغر راہیؔ نے اپنے دل کا بخار اس طرح نکالا کہ "مظہر امام صاحب، سالکؔ لکھنوی کے ساتھ موٹر میں جانا چاہتے تھے، اس لئے ہم لوگوں کے ساتھ نہیں آئے۔"

چورنگی ریستوراں میں سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ اپنے دوست، ساتھی بنگالی، ہندی اور اردو کے ادیب۔ یہ پارٹی ترقی پسندوں کی طرف سے تھی، لیکن مجھے یعنی انجمن ترقی پسند مصنفین کلکتہ کے سکریٹری کو اس کی واقفیت نہ تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ ہمارے ایک دوست راجندر بھارتی کو، جو ہندی اور اردو کے اخباروں کے لئے اشتہارات فراہم کیا کرتے تھے اور لکھنے لکھانے کا شوق بھی رکھتے تھے، کرشن چندر کی آمد کا علم ہوا، اور انھوں نے دوڑ دھوپ کرکے انتہائی عجلت میں اس نشست کا انتظام کیا۔ ظاہر ہے، بہت سے رفیقوں کو اطلاع نہ ہو سکی۔ اس نشست کی صدارت ہیرن مکرجی نے کی۔ کرشن چندر نے خواہش ظاہر کی کہ انھیں کلکتہ میں بنگلہ، ہندی اور اردو ادب کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا جائے۔ ہیرن مکرجی اور گوپال ہلدار نے بنگالی ادب میں نئے رجحانات کی بابت تقریریں کیں۔ ہندی کی نمائندگی صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے ہندی ہفتہ وار "سوادھینتا" (स्वाधीनता) کے اڈیٹر انور اگی نے کی۔ مجھے پہلے سے نہ تو اس جلسہ کا کوئی علم تھا اور نہ یہ خبر تھی کہ وہاں کلکتہ میں اردو ادب خصوصاً ترقی پسند ادبی تحریک کی رفتار کے بارے میں اظہار خیال کرنا ہوگا۔

اس لئے جب اردو کے بارے میں گفتگو کرنے کی بات آئی تو میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں اُن دنوں کلکتہ میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند مصنّفین کی مشترکہ انجمن کا سکریٹری تھا اور اس نشست کے صدر کی حیثیت سے ہیرن مکرجی اور دیگر رفیقوں نے مجھ ہی سے فرمائش کی تھی کہ میں اُردو ادب کے بارے میں کچھ کہوں۔ لیکن میں اچانک اس تبصرے کے لئے تیار نہ تھا، اس لئے میں نے سالک لکھنوی کی طرف اشارہ کر دیا۔

کرشن چندر کے اعزاز میں دی ہوئی پارٹی نے کئی ہنگامے کھڑے کر دیئے۔ پہلا ہنگامہ جس نے کلکتہ کی ساری صحافتی برادری کو بیدار کر دیا، سالک لکھنوی کی تقریر کے سلسلے میں تھا۔ ۲۹ ستمبر کو اس پارٹی کی روداد شایع کرتے ہوئے روزانہ "عصر جدید" نے اس تقریر کو "غیر ذمہ دارانہ اور توہین آمیز" بتایا۔ دوسرے دن کے "عصر جدید" میں شہزاد منظر کا لکھا ہوا ایک طویل مراسلہ "کلکتہ کے ادیبوں اور شاعروں کی توہین" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے بڑے سخت لفظوں میں سالک لکھنوی کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے مجھ سے بھی برہمی کا اظہار کیا اور میری "خاموشی" کو "مصلحت اندیشی" سے تعبیر کیا۔ ان کے الفاظ میں:

> " اردو ادب کے متعلق کچھ کہنے کا موقع آیا تو صدر اور حاضرین کی طرف سے مظہر امام (موجودہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کلکتہ کے سکریٹری) سے تقاضہ کئے جانے کے باوجود مظہر امام نے اس سلسلہ میں نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر معذوری ظاہر کی، حالانکہ اس وقت تک وہ انجمن کے سکریٹری تھے اور ان کا فرض تھا کہ وہ اس سلسلہ میں انجمن کی سرگرمیوں، اس سے متعلق ادیبوں اور شاعروں یا مجموعی طور سے کلکتہ کے ادبی ماحول کے متعلق کچھ کہتے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں انھوں نے کلکتہ کے قابلِ ذکر شاعروں اور ادیبوں کی ایک فہرست بنائی تھی، لیکن پتہ نہیں کس بنا پر اور کس مصلحت سے انھوں نے خاموشی برتنے ہی میں بہتری سمجھی۔"

اسی دن "عصرِ جدید" کے مزاحیہ کالم میں انھیں باتوں کا اعادہ کیا گیا تھا اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی :

"راویِ معتبر اس طرح روایت کرتا ہے کہ جب اردو کے مشہور ادیب اور سب سے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر تشریف لائے تو ترقی پسند مصنّفوں کی طرف سے ایک شاندار پارٹی دی گئی اور چونکہ سخت خطرہ اس بات کا تھا کہ کسی چور دروازے سے کوئی قدامت پسند یا تنزل پسند ادیب نہ گھس آئے، اس لئے اُن تمام اخبارات کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی، جن کے متعلق ذرا بھی قدامت پسندی کا شبہ تھا۔ اس طرح اس پارٹی میں صرف ترقی پسند جمع ہو سکے اور دوسرے خیال والے اِس خبر سے بھی محروم رہ گئے کہ کرشن چندر صاحب کلکتہ تشریف لائے ہیں۔"

سالک لکھنوی اور ابراہیم ہوش سے کاروباری، صحافتی اور ادبی چشمک کے باعث دوسرے صحافیوں نے موقع کا فائدہ اُٹھا۔ ان دنوں کلکتہ میں ترقی پسند نقطۂ نظر رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ پرویز شاہدی، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی اور مظہر امام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اخباروں نے کوشش کی کہ آپس میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں اور کلکتہ کے واحد اہم ادبی حلقے کو ضرب پہنچائی جائے۔ یکم اکتوبر کو روزنامہ "امروز" نے ایک انتہائی رکیک اداریہ لکھا، جس کا عنوان تھا "ترقی پسندوں میں جنگ" اس اداریہ میں عنوان بتائے بغیر، کرشن چندر کے ایک افسانے "ایک ہزار چار سو بہتر لڑکیاں" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، کرشن چندر اور پرویز شاہدی کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور سالک لکھنوی کو مجھ سے بدگمان کرنے کے لئے شعوری طور پر ذہنی پستی کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہاں "نقلِ کفر" بھی مناسب نہیں۔

مراسلہ بازیوں کا سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا۔

اسی سلسلے کے ایک دوسرے ہنگامے یا بحث کی روداد سنئے :

ہوا یہ کہ جب اسی چورنگی ریستوراں والی ٹی پارٹی میں کرشن چندر چائے نوش فرما چکے تو اِن سے بھی کچھ ارشاد فرمانے کی گذارش کی گئی۔ کرشن چندر نے یہ شوشہ چھوڑا کہ وہ کوئی باضابطہ تقریر کرنے کے بجائے سوالوں کے جواب دینا پسند کریں گے۔ اب میری شامت جو آئی تو میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیمی بے حسی کے بارے میں سوال کر ڈالا۔ کرشن چندر ۵۳ء سے کُل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکرٹری تھے۔

تنظیمی بے حسی کی بابت میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کرشن چندر نے کہا کہ انجمن اپنا رول پورا کر چکی ہے اور موجودہ حالات میں اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں مارکسزم کے نظریہ کی بنیاد پر ایک ایسی انجمن بنانا چاہئے جو ملک کو سوشلزم کی منزل تک لے جانے میں مُمِد ہو۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "اگر ایسا ہے تو انجمن کی موت کا اعلان کیوں نہیں کر دیا جاتا؟"

کرشن چندر نے مُسکراتے ہوئے معصوم قطعیّت کے ساتھ جواب دیا "موت کے باضابطہ اعلان کی ضرورت نہیں ہوتی، موت آپ اپنا اعلان ہے۔"

یہاں پھر ایک بے تعلق سی لیکن دلچسپ بات یاد آرہی ہے۔ کسی نے کرشن چندر سے ایک طویل سوال کیا تھا، جس کے الفاظ اب یاد نہیں رہے۔ کچھ جدلیاتی مادّیت وغیرہ کا ذکر تھا۔ کرشن چندر نے برجستگی سے کہا تھا: "بھئی، آپ جانتے ہیں، میں گدھا ہوں، بات ذرا دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ آپ اپنے سوال کا مفہوم مختصر لفظوں میں بیان کیجئے۔"

کرشن چندر کی خودگذشت بہ عنوان "ایک گدھے کی سرگذشت" کچھ عرصہ پہلے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور جیسا کہ خود انھوں نے بتایا تھا، لوگ ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کرتے تھے: "وہ دیکھو، وہ گدھا جا رہا ہے۔"

میرے سوال اور کرشن چندر کے جواب کا حوالہ دیتے ہوئے ماہنامہ "سہیل" گیا کی اکتوبر ۵۷ء کی اشاعت میں کلام حیدری نے "نئے حالات اور ہم" کے عنوان سے ایک مضمون

لکھا، جس میں کرشن چندر کے بیان کی وضاحت طلب کی گئی اور ان سے دریافت کیا گیا کہ اب اگر وہ مارکسی بنیاد پر تنظیم چاہتے ہیں تو وہ کیسی ہوگی۔ ایک جگہ کلام حیدری نے لکھا تھا:

"..... انھوں نے (کرشن چندر نے) یہ نہیں کہا کہ انجمن چند افراد کی گروپ بندیوں کا شکار ہو گئی۔ انھوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ انجمن نظریاتی انتہا پسندی (جو ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی انتہا پسندی کی ایک جھلک تھی) کی بھینٹ چڑھ گئی ..... کرشن چندر نے یہ بھی نہیں کہا کہ بین الاقوامی پیمانے پر نظریاتی تبدیلیوں (بلکہ "بتوں" کی تبدیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا) نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو تو ایک طرف، سیدھے سیدھے کمیونسٹوں ہی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور پرانے بتوں سے نئے بتوں تک آنے کے عبوری زمانے میں "ترقی پسندی" کی بنیاد پر کسی ادبی انجمن کی تنظیم ممکن نہیں۔"

دوسرے مہینے یعنی نومبر کے "سہیل" میں شہزاد منظر نے کلام حیدری کے جواب میں ایک مضمون شایع کرایا۔ جس کا عنوان تھا "انجمن ترقی پسند مصنفین کی ضرورت"۔ اس مضمون میں کرشن چندر کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ترقی پسندوں کی تنظیم ٹوٹنے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

"کلام حیدری نے اپنے مضمون میں جس طرح ذہنی جھلاہٹ کا اظہار کیا ہے، وہ قطعی غیر مناسب اور ناجائز ہے۔ کلام حیدری ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین، سوویت روس اور بین الاقوامی کمیونزم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے کوئی اور ذریعہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ خواہ مخواہ کرشن چندر کی قطعی ذاتی رائے کو ایک ذریعہ بنا کر ادبی سنسنی اور تہلکہ مچانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

یہ ہنگامے ادبی یا صحافتی محاذ پر ہوئے۔ اب داستان کا وہ حصہ سنئے جو ۔ اہ
ذاتی نوعیت کا ہے:

چورنگی ریستوراں والی نشست کے بعد جب سب لوگ باہر آئے تو میں نے
کرشن چندر سے شکایت کی کہ آپ اتنے دنوں سے کلکتہ آئے ہوئے ہیں، لیکن آپ نے اپنی
آمد کی اطلاع ہم میں سے کسی کو نہ دی۔ کرشن چندر نے کہا "چلئے ہوٹل چلتے ہیں، وہیں باتیں
کریں گے۔"

میجسٹک ہوٹل پہنچ کر مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک دو باتیں یاد رہ
گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے پاس اتنی ڈاک آتی ہے جتنی بہت سے فلمی ہیرو کے
پاس بھی نہیں آتی۔ میرے ایک استفسار پر انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ فلمیں بنا رہے تھے تو
پروڈیوسر نے انہیں گاڑیاں دے رکھی تھیں۔ اب ان کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔ انہوں نے
یہ بھی بتایا تھا کہ روس سے نقد کی صورت میں رائلٹی نہیں آسکتی۔ البتہ اس رقم سے چیزیں خرید کر
لائی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی چیزیں لانا ممکن نہیں۔

دوسرے دن شام کو دوبارہ ملنے کا پروگرام طے ہوا۔ میں نے پرویز شاہدی کو
اطلاع دی۔ پھر ہم دونوں ل۔ احمد اکبر آبادی کے یہاں گئے۔ وہاں اتفاق سے جمیل مظہری
بھی موجود تھے۔ ہم سب کرشن چندر کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا وہ صبح سے بخار میں مبتلا ہیں۔
وہ ایک امریکی رسالے سے دل بہلا رہے تھے، جس میں نیم برہنہ (بلکہ 'نیم' سے کچھ زیادہ)
تصویریں تھیں۔ اس کا نام FOLLIES تھا۔ (کلکتہ سے رخصت ہوتے وقت
انہوں نے وہ رسالہ مجھے بخش دیا، جو ان کی یادگار کے طور پر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔)
ہم لوگوں کے اصرار پر وہ بستر پر لیٹ گئے۔ جمیل مظہری سے تعارف ہوا تو کرشن چندر بولے کہ
میں آپ سے واقف ہوں اور آپ سے پونا میں جوش صاحب کے یہاں مل چکا ہوں۔ پرویز شاہدی سے
وہ اپنے زیرِ تصنیف ناول "خدا جہنم میں" کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے: "اس کا تھیم یہ ہے
کہ خدا ایک دفعہ دنیا میں آتا ہے اور یہاں ارباب اختیار نے اذیت کوشی کے جو ذرایع اختیار

کرر کھے ہیں، انہیں دیکھ کر وہ کانپ جاتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں اس کی بنائی ہوئی جہنم تو بہت حقیر ہے۔"

پرویز شاہدی نے دریافت کیا۔ "کیا اس میں concentration camps اور Electric chair وغیرہ کا ذکر ہوگا؟"

کرشن چندر بولے: "ابھی میں بتانا نہیں چاہتا کیونکہ ناول کا اصل لطف ضایع ہو جائے گا، لیکن ان سب سے زیادہ ہیبت ناک ظلم اور جبر کے مظاہر پیش کئے جائیں گے۔" انھوں نے بتایا کہ یہ ناول ہندی میں جلد ہی قسط وار شایع ہونے والا ہے، لیکن اردو میں کون شایع کرے گا، کہا نہیں جا سکتا۔ یہ ناول آج تک شایع نہیں ہو سکا۔ کرشن چندر نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔ "شاید خدا کی مرضی نہیں ہے۔"

باتوں کے دوران کرشن چندر کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ بخار تیز ہو گیا تھا اور سر کا درد بڑھ چلا تھا۔ بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے بڑے رنجیدہ لہجے میں بولے: "بھائی پرویز! اب کفن دفن کا انتظام کرو۔ تمہارے کلکتہ نے مار ڈالا۔ ہائے۔"

پرویز صاحب نے ان کے بازو کو تھپکتے ہوئے تسلی دی "کیوں گھبراتے ہو صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں اپنے ملازم کو بھجوا دیتا ہوں، وہ رات کو یہیں رہے گا۔"

کرشن چندر بولے: "مظہر امام بھی رہ جائیں تو ٹھیک رہے گا۔ میں تو یہاں بالکل اکیلا ہوں۔"

ایک بڑے فن کار کی تیمارداری کی سعادت میرے لئے "مسرت بخش" تھی!

کرشن چندر جس اضطراب اور بے چینی کا مظاہرہ کر رہے تھے، وہ اچھے اچھوں کے اطمینانِ قلب کو متزلزل کرنے کے لئے کافی تھا۔ پونچھ کے رہنے والے ان کے بچپن کے ایک دوست، جو کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے، رات کے دس بجے ایک ڈاکٹر کو بلا لائے جس نے کچھ دوائیں تجویز کیں۔ جب میں دوا لانے چورنگی پہنچا تو لگ بھگ گیارہ بج رہے تھے۔

عام طور پر اس وقت تک دواخانے بند ہو چکتے ہیں۔ اتفاق سے ایک ڈسپنسری کھلی تھی۔ میں دوائیں لے کر ہوٹل پہنچا تو پرویز صاحب کا ملازم نظیر آچکا تھا۔ وہ کرشن چندر کو جانتا تھا، کیونکہ ۵۲ء میں کل ہند امن کانفرنس کے دنوں میں کرشن چندر پرویز شاہدی ہی کے یہاں مقیم تھے۔

اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار، دنیا کے ایک عظیم ملک کا ایک عظیم فنکار بستر علالت پر تھا اور میں اس کی تیمارداری پر مامور — جس نے آج تک کسی کی تیمارداری نہیں کی تھی، جو اس فن سے قطعی نابلد تھا۔

کرشن چندر کو ۱۰۱ ڈگری سے زیادہ بخار نہ تھا، لیکن وہ مسلسل کراہ رہے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھتے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

کہنے لگے: "بھائی امام! اب بچنے کی کوئی امید نہیں۔ موت کو بھی آنا تھا تو کہاں آئی!" سر کے درد کی بار بار شکایت کرتے اور میں پوری طاقت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے ان کا سر دباتا۔ اس سے تھوڑا آرام ملتا تو کہتے: "پورا بدن ٹوٹ رہا ہے، کسی کروٹ چین نصیب نہیں ؏

آج کی رات مسافر پہ بہت بھاری ہے"

میں پھر اپنی پوری طاقت صرف کر کے ان کے پاؤں اور کمر دباتا۔ اس دوران میں ان کے سر کا درد پھر بڑھ چکا ہوتا۔ اب میں سر کی طرف رجوع کرتا اور میرے کانوں میں یہ آواز آتی: "آہ! صبح تک زندہ نہیں رہوں گا...... کچھ نہ دوا نے کام کیا......"

مجھے کرشن جی کی بے دلی اور بد دلی پر دل ہی دل میں ہنسی بھی آتی۔ لیکن میں اپنے چہرے پر پوری سنجیدگی طاری کیے ہوئے ان کی خدمت میں مصروف رہا۔ رات کے پچھلے پہر تھوڑی دیر کے لیے کرشن جی کو نیند آگئی۔ میں جاگتا رہا۔ میرے لیے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا

کہ میں نے کسی مریض کے سرہانے پوری رات جاگ کر گزاری ہو۔

کرشن چندر بمبئی جاکر مرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ چند دن اور کلکتہ ٹھہرتے، لیکن انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کا جنازہ کلکتہ میں اُٹھے۔ انھوں نے دوسری صبح کی فلائیٹ سے اپنے لئے سیٹ بُک کرالی تھی۔ صبح تک ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ کہنے لگے: "کلکتہ کی گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں جب پنجاب میں تھا، گرمیوں میں پہاڑوں پر چلا جاتا تھا۔ میں بیمار نہیں پڑتا، اس لئے بیمار ہونے پر جلد گھبرا جاتا ہوں۔"

رات کے کرشن چندر صبح کو یکسر بدل چکے تھے۔ اب وہ موت کا ذکر چھوڑ کر زندگی کی باتیں کر رہے تھے۔ عباس، ساحر، جاں نثار اختر اور رامانند ساگر کی باتیں۔ میں نے ان سے دھرم پرکاش آنند کے بارے میں دریافت کیا، جنھوں نے کسی زمانے میں "ادبی دنیا" "ادب لطیف" وغیرہ میں جنس کے موضوع پر بڑے خوبصورت افسانے لکھے تھے اور کرشن چندر نے "نئے زاویے" کی پہلی جلد اور غالباً "نئے افسانے" میں بھی انھیں شامل کیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ آنند دہلی میں افسری کرتے ہیں اور افسانہ نگاری سے تائب ہو گئے ہیں۔

ساحر کسی زمانے میں کرشن چندر کے اندھیری والے مکان کے گیرج میں اور پھر ان کے مکان کی اوپری منزل میں رہا کرتے تھے، لیکن اُن دنوں کسی بڑے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ ساحر اور مجروح کے ذکر پر بولے: "اب تو میں نے دونوں ہی سے ملنا بند کر دیا ہے، کیوں کہ جب بھی ان میں سے کوئی ملتا ہے، سوائے دوسرے کی شکایت کے کوئی اور بات ہی نہیں کرتا۔"

بمبئی کے اردو شاعروں کے آپس کے تعلقات کے بارے میں مجھے اس بیان کی تصدیق ہوئی جب میں نے انگریزی کے نئے شاعر ڈام موریس کا سفرنامہ پڑھا۔ اس نے لکھا ہے کہ جب میں ملک راج آنند سے ملنے گیا تو انھوں نے کہا کہ بمبئی میں اردو کے چھ بلند پایہ شاعر ہیں، لیکن ان کے آپسی تعلقات کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف میرے یہاں کھانے پر اکٹھے ہوتے ہیں اور تب ہی آپس میں ان کی بات چیت ہوتی ہے۔

کرشن چندر نے واپس بمبئی پہنچ کر اپنے مخصوص مزاح کی چاشنی لئے ہوئے ایک انتہائی محبت آمیز خط لکھا جو ان کی اخلاقی سربلندی کا بھی آئینہ دار ہے :

"جب کلکتے سے نکلا تو ۱۰۲ درجہ حرارت تھا۔ یہاں پہنچ کر پھر ۱۰۴ ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک بستر پر دراز رہا ہوں۔ دو تین روز سے بخار نہیں ہے، لیکن نقاہت شدید ہے۔ کلکتہ سے جو فلو میں لایا تو یہاں سب کو بانٹ دیا۔ چنانچہ ان دنوں میری بیوی بچے، میرا سکرٹری اور گھر کے دوسرے ملازمین سب فلو سے بیمار پڑے ہیں۔ ہمسائے آکے دیکھ بھال کرتے ہیں اور ان کے باورچی کھانا پکاتے ہیں۔ مہندر جی مزاج پرسی کے لئے آیا کرتے تھے۔ تین روز سے وہ بھی اپنے گھر میں فلو میں مبتلا ہیں ــــ کہئے آپ تو خیریت سے رہے ؟ میرے جانے کے بعد !

ابھی تو یہ حال ہے کہ کلکتہ کے نام سے ہی وحشت ہوتی ہے (حالاں کہ اب تو بیچارے وحشت بھی کلکتہ میں نہ رہے) ــــ حالاں کہ آپ کی محبت اور رفاقت نے کلکتے میں بڑا سہارا دیا اور یہ خوبصورت بات ہمیشہ دل میں رہے گی ..... افسوس کہ اپنی علالت کی وجہ سے آپ سے ملاقات بڑی سرسری اور بے لطف رہی۔"

اسی خط میں انہوں نے پوچھا تھا : "شاہد پرویزی کس حال میں ہیں ؟" میں نے پرویز شاہدی کو یہ خط دکھایا تو انہیں یہ بات گراں گذری کہ کرشن چندر ان کا نام لینے میں غلطی کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں اس سلسلے میں لکھا تو ان کا بڑا دلچسپ جواب آیا :

"شاہد پرویزی، توبہ توبہ، پرویز شاہدی کو میری طرف سے بہت بہت پیار۔ اگر میں اپنی علالت کے زمانے میں ان کا نام غلط لکھ گیا تو کیا مضائقہ ہے ؟ انہیں بھی مجھے کرشن چندر کے بجائے "چرشن کندر" کہہ دینے کا حق ہے۔ وہ اس حق کو ہمیشہ استعمال کر سکتے ہیں۔"

کرشن چندر سے خط و کتابت کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے ایک خط میں دریافت کیا کہ کیا آپ بھی اپنی تحریروں پر تنقیدیں پڑھ کر ناگواری محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے پرزور الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہوئے اپنے ۲۲ نومبر ۵۷ء کے خط میں مجھے لکھا:

"اس ملک کے ادیبوں میں یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے ادب کے خلاف کوئی بات سن ہی نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک غلط قسم کی تنقید نگاری کا رجحان جڑ پکڑ رہا ہے۔ بیشتر تنقیدیں تو دوست نوازی کے اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں اور بعض بغض اور منافرت کی بنا پر۔ اس طرح سے صحت مند تنقید نہیں ہوتی ..... اگر میں واقعی اوّل درجے کا ادب پیش کرتا ہوں تو یہ تمام مخالفت تاریخ کی نظروں میں بے معنی ہو جائے گی، اور اگر واقعی میں بُرا ادب پیش کرتا ہوں تو میرے تمام دوستوں کی مدح و ستائش مجھے ادبی موت سے کبھی نہ بچا سکے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ ادیبوں کو ادب کے معاملے میں اپنے دل وسیع رکھنے چاہئیں۔ اس وسعت نظری کے بغیر اول درجے کا بلکہ دوم درجے کا ادب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اپریل ۵۸ء میں میری شادی ہوئی تو میں نے کرشن چندر کو اس کی اطلاع دی۔ ان کا خط آیا:

"آپ نے شادی کر ڈالی؟ خدا آپ کو خوش رکھے اور شادی کی ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ عورتوں کے متعلق میرا اب یہ عقیدہ ہے کہ دور سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔"

کرشن چندر کی دعا کا وہی حشر ہوا جو اس طرح کی دعاؤں کا ہوتا ہے! میرا خیال ہے کہ انھیں عورتیں دور سے ہی نہیں، نزدیک سے بھی اچھی معلوم ہوتی تھیں! اس کی تصدیق جلد ہی ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد منظر شہاب نے بتایا کہ وہ پٹنہ سے دربھنگا جانے کے لئے بذریعہ

اسٹیمر گنگا پار کر رہے تھے کہ انہیں کرشن چندر ایک سُوٹ کیس پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ پہلے تو انہیں پہچاننے میں تکلف ہوا، پھر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ آپ اس طرف کہاں ؟ معلوم ہوا کہ وہ تسنیم سلیم چھتاری کی دعوت پر ان سے ملنے چکیہ (موتی ہاری) جا رہے ہیں۔ ان دنوں تسنیم سلیم کے شوہر وہاں ایک شوگر مل کے منیجر تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کرشن چندر سے سلمیٰ صدیقی کی دوستی یہیں پروان چڑھی ! واللہ اعلم۔

۱۹۶۱ء میں پرویز شاہدی 'یوم جگر' میں شرکت کے لئے کٹک آئے تو انہوں نے خبر دی کہ کرشن چندر نے سلمیٰ صدیقی سے شادی کر لی ہے۔ اس کی اطلاع انہیں بنّے بھائی سے کلکتے میں ملی تھی۔ کرشن چندر کے ذوقِ حُسن کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں اور سلمیٰ صدیقی کے حُسن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے پہلی بار ان کی تصویر "شعاعیں" نام کے دہلی کے ایک رسالے کے افسانہ نمبر ۱۹۴۹ء میں سرورق پر دیکھی تھی۔ اسی رسالے کے کسی اور شمارے میں خورشید عادل منیر اور ان دونوں کے پہلے بچّے کی تصویر بھی سلمیٰ کے ساتھ چھپی تھی۔ اس رسالے میں دونوں میاں بیوی کے افسانے شائع ہوتے رہتے تھے۔ (خورشید عادل منیر کے افسانے میں نے "ساقی" میں بھی دیکھے تھے) ۱۹۵۰ء ۔ ۵۱ء میں سلمیٰ خورشید منیر "شعاعیں" کی مجلس ادارت میں بھی شامل تھیں۔ کرشن چندر کی تحریریں بھی اِس رسالے میں آنے لگی تھیں۔ کرشن اپنی بیوی سے ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اور شاید اسی لئے ایک آستاں سے دوسرے آستاں تک بھٹکتے رہے۔ شاہد احمد دہلوی نے کرشن چندر پر لکھے ہوئے اپنے خاکے میں اُس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے جب وہ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ تھے، لکھا ہے کہ ان کے بارے میں بُری بُری باتیں سننے میں آتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ "بُری بُری باتیں" کرشن چندر کی حُسن پرستی سے متعلق ہی رہی ہوں گی۔ ہمارے یہاں "شاہد و شراب" کے ذکر سے ہی تیوریوں پر بَل پڑ جاتے ہیں۔ استحصال، رشوت ستانی، بے ایمانی، فریب کاری ہمارے معاشرے کا مَن بھاتا کھاجا ہیں !

سلمیٰ صدیقی سے کرشن چندر کی شادی ایک عرصے تک موضوع گفتگو اور مسئلہ بحث بنی رہی۔ ہماری سرحد کے اُس پار تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں جو کچھ لکھا گیا، میں نے نہیں دیکھا،

لیکن وہاں کے ایک رسالے شاید "ادب لطیف" میں انہیں دنوں کرشن چندر کا ایک خط چھپا تھا جس میں انہوں نے اس موضوع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اڈیٹر سے درخواست کی تھی کہ وہاں جو گندگی اچھالی جارہی ہے، اسے ختم کرانے کی کوشش کریں۔ ان دنوں یہ بات بھی پھیلی کہ یہ شادی اسلامی طریقے سے ہوئی، باقاعدہ نکاح ہوا۔ کرشن چندر نے اسلام قبول کیا اور اپنا نام وقار ملک رکھا۔

اس شادی کے چھ سات سال بعد شاعر کا ایک ضخیم اور نہایت عمدہ کرشن چندر نمبر ۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں علی گڈھ کے کسی قلم کار کی کوئی تحریر نہیں تھی۔ سنا گیا کہ رشید احمد صدیقی کی خاطر شکنی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہاں کے کسی ادیب نے اس نمبر کے لئے لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رشید صاحب نے اس شادی کے بعد کبھی کرشن چندر سے ملنا گوارا نہیں کیا، لیکن سلمٰی صدیقی سے ان کے تعلقات کرشن چندر کی زندگی میں ہی قائم ہو گئے تھے۔ اس کا ثبوت سلمٰی کے نام ان کے وہ خطوط ہیں جو لطیف الزماں خاں کے مرتب کردہ مجموعے میں شامل ہیں۔ میں نے "شاعر" کے اس نمبر میں کرشن چندر پر محمد حسن عسکری کا وہ طویل مقالہ بھی شائع کرادیا تھا جو "اردو ادب میں ایک نئی آواز" کے عنوان سے اگست ۴۱ء کے "ساقی" میں چھپا تھا۔ خود کرشن چندر بھی اس مضمون کو بھول گئے تھے، اور بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ محمد حسن عسکری نے، جو کرشن چندر کے مخالفوں میں شاید سب سے موثر آواز تھے، کبھی ان کی افسانہ نگاری پر ایک انتہائی توصیفی مضمون بھی لکھا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے لکھا ہے کہ ایک بار انہوں نے عسکری سے اس مضمون کا ذکر کیا تو وہ ٹال گئے۔ ۴۹ء میں "سیارہ" کراچی میں عسکری نے کرشن کا جو انتہائی محبت آمیز خاکہ لکھا تھا اس پر کسی کی نگاہ ہی نہیں گئی۔

کرشن چندر سے ایک تفصیلی لیکن آخری ملاقات ۷۳ء میں کانپور اور لکھنؤ میں ہوئی۔ نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ کی جانب سے کانپور کے کملا کلب کے احاطے میں ایک کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اسی تقریب میں ایسوسی ایشن کی جانب سے اُس وقت کے نائب صدر جمہوریۂ ہند جی۔ اس۔ پاٹھک کے ہاتھوں کرشن چندر اور کیفی اعظمی کو انعامات بھی دئے گئے تھے۔ مشاعرے کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی۔ کیفی اعظمی کو، ان کے معذور ہونے کے بعد، میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ فرش کی بجائے کرسی پر بیٹھنے لگے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے اُن کی

صاحبزادی شبانہ اعظمی سیدھے سادے لباس میں اسٹیج پر موجود تھیں۔ اُس وقت تک ان کی پہلی فلم "انکُر" بھی ریلیز نہیں ہوئی تھی، اور فلمی اداکارہ کی حیثیت سے کم ہی لوگ انہیں جانتے تھے۔ البتہ مشاعرے میں مشہور فلم اسٹار نگار سلطانہ کی نوخیز بیٹی حنا کوثر اپنے تمام قاتلانہ گلیمر کے ساتھ بحیثیت شاعرہ شریک تھیں، اور انہیں ہی مشاعرے میں سب سے زیادہ داد ملی تھی۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم "پرچھائیاں" شروع کی، لیکن مجمع نے سُننا گوارا نہ کیا۔ کسی نے "تاج محل" کا لقمہ دیا۔ ساحر کی وہ نظم بھی بے دلی کے ساتھ سُنی گئی۔ مشاعرے میں اتنی بھیڑ تھی کہ اسے کنٹرول کرنا مشکل تھا۔ افراتفری کا یہ عالم تھا کہ مجروح سلطان پوری مشاعرہ گاہ کے گیٹ تک پہنچے تو کسی نے انہیں اندر جانے نہ دیا۔ وہ واپس چلے گئے اور مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ اسی محفل میں پہلی بار احمد جمال پاشا اور عابد سہیل سے ملاقات ہوئی۔

منتظمین مشاعرہ نے جس جگہ میرے قیام کا انتظام کیا تھا، وہیں فراق، مجروح، شاذ تمکنت، زبیر رضوی وغیرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاذ کہنے لگے کہ میں تمہارا یہ شعر اپنی محبوبہ کو اکثر سُناتا ہوں:

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری   کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے!

مشاعرے کے دوسرے روز میں شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں منتقل ہوگیا جو ان دنوں وہیں کانپور میں ڈائرکٹر پوسٹل سروسز تھے۔ انہیں بھی غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس میں بحیثیت آبزرور شریک ہونا تھا اور مجھے بھی۔ انہیں کی گاڑی میں لکھنؤ تک کا سفر کیا۔ رام لال نے میرے قیام کا انتظام کہیں اور کیا تھا، لیکن رتن سنگھ مجھے کھینچ کر اپنے یہاں لے گئے۔ وہ اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں پروگرام اگزیکٹو تھے۔ اُن سے بھی یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر کبھی ن۔ م۔ راشد اور کرشن چندر بھی رہ چکے ہیں۔

غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس میں بہت سی مقتدر شخصیتیں تھیں، مگر مرکزِ نگاہ کرشن چندر ہی تھے، ہر چند انہیں اس وقت تک non-writer قرار دیا جا چکا تھا اور جدیدیت پسندوں کا حلقہ ان سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ یہ جدیدیت کے عروج کا زمانہ تھا، اور ایسا

لکھا تھا کہ ترقی پسندی اپنی معنویت کھو چکی ہے، مگر کرشن چندر ان آتی جاتی لہروں سے بے نیاز لکھے جا رہے تھے۔ ان کا ناول "آدھا راستہ" عابد سہیل نے انہیں دنوں چھاپا تھا۔ ہوٹل گمگر میں، جہاں کرشن چندر کا قیام تھا، میں نے عابد سہیل کو ان سے اس ناول کے اگلے حصے کی تکمیل کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔

کانفرنس کے الگ الگ اجلاسوں میں اور ان سے باہر میرا ساتھ زیادہ تر کرشن چندر کے ساتھ رہا۔ وہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا سے بھی اسی بے تکلفی سے ملتے جس طرح اپنے کسی بے شناخت قاری سے۔ عظمت ان کے شانوں تک پہنچ کر بہت سبک ہو گئی تھی۔ کانفرنس میں اردو کی بقا اور ترویج کے سلسلے میں بہت سی تجویزیں پیش ہوئیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے منظوری سے پہلے تجویزوں پر بحثیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے کئی بحثوں میں حصہ لینے کے لئے مجھے مجبور کیا۔ اور جب ریڈیو سے متعلق ایک تجویز پیش ہوئی، کہ اردو کو اس ذریعۂ ابلاغ میں خاطر خواہ جگہ ملنی چاہیے تو انہوں نے خود جا کر مائک پر میرے نام کا اعلان کیا۔ وہ شہر میں کئی جگہ گئے۔ رکشے پر میں ہمیشہ ان کا ہم سفر رہا۔ ان کے لئے گاڑی وزیر اعلیٰ کے یہاں سے بھی آسکتی تھی، یا ان کے کسی بھی اہل ثروت مداح کے یہاں سے۔ مگر انہوں نے کسی سے یہ احسان لینا گوارا نہ کیا۔ ہوٹل میں اور رکشے پر ان سے بہت سی باتیں ہوئیں، ترقی پسندی اور جدیدیت کی، بمبئی کی فلمی زندگی کی، ان کی نئی تحریروں کی۔ میں نے عسکری کا ذکر چھیڑنے کے لئے کہا کہ میں نے ان کا مضمون "شاعر" کے نمبر میں چھپوا دیا تھا۔ کہنے لگے: "تم نے بہت اچھا کیا، مجھے یہ مضمون یاد نہیں تھا، مہندر جی کو بھی نہیں۔" ان سے عسکری کی مخالفت کی بات چل نکلی۔ بولے: "پہلے وہ بھی ترقی پسندی سے متاثر تھے۔ دہلی میں کئی بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ محبت سے ملتے تھے، پھر پتہ نہیں کیوں وہ میری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ تقسیم کے بعد تو انہوں نے باقاعدہ میرے خلاف محاذ آرائی کی۔"

میں نے کہا: "جی ہاں، میں نے "سنگ میل" وغیرہ میں ان مضامین کے بارے میں پڑھا تھا جو انہوں نے آپ کے خلاف بعض اخبارات اور رسائل میں لکھے تھے۔ خاص طور پر

فسادات پر لکھے ہوئے آپ کے افسانوں پر وہ بہت معترض تھے۔ ان دنوں وہ منٹو کو بڑھا رہے تھے۔
ان کے ساتھ مل کر "اردو ادب" کا اجرا بھی کیا تھا، پھر انہوں نے پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا۔"
میں نے مزید کہا: "تقسیم سے پہلے بھی وہ "جھلکیاں" میں آپ پر بالواسطہ طنز کرتے
رہتے تھے۔ "ان داتا" کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ قحط بنگال پر لکھے ہوئے افسانوں سے گھسے
ہوئے پیسوں کی بو آتی ہے۔ ویسے اپنے خاکے میں آپ سے دوستی کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔"
کرشن چندر خاموش رہے۔ میں نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے دریافت کیا: "آپ
سلمیٰ بھابھی کو نہیں لائے؟"
کہنے لگے: "بھائی، انہیں یہاں تکلیف ہوتی۔ وہاں تو قدم قدم پر ٹیکسی مل جاتی ہے۔
لکھنؤ کے ان چھوٹے چھوٹے رکشوں پر بیٹھنا ان کے لئے دشوار ہوتا۔"

پھر میں پٹنہ میں سخت بیمار رہا۔ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہوا تھا کہ میں تبدیل ہو کر
سری نگر چلا گیا۔ میرے وہاں پہنچنے سے قبل کرشن چندر آخری بار کشمیر آئے تھے۔ بعض دوستوں
نے بتایا: "بہت رقیق القلب ہو گئے ہیں۔ زیادہ پی لیتے ہیں اور رونے لگتے ہیں۔" نہ جانے کون سی
خلش تھی، نا آسودگی اور محرومی کا کون سا احساس تھا، جس نے انہیں مضطرب کر رکھا تھا۔ دل کا
حملہ ہوا، پیس میکر لگایا گیا..... انتقال کی خبر آئی تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کرشن چندر سے
میرا جتنا جذباتی تعلق رہا ہے، کسی اور ادیب سے نہیں رہا۔ ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں نے
سری نگر دوردرشن کے مذاکرے میں کہا کہ موجودہ تنقید کرشن چندر کی دشمن ہے، لیکن یہ تنقید اپنی
موت آپ مر جائے گی، کیوں کہ کرشن چندر کے لازوال افسانوں کی تعداد ان تیروں سے زیادہ ہے
جو اُن پر برسائے گئے ہیں!

۱۹۷۹ء میں مجھے ایک تربیتی کورس سے وابستگی کے سبب چھ ماہ تک فلم اینڈ ٹیلی ویژن
انسٹی ٹیوٹ پونا میں رہنا پڑا۔ فروری میں اعجاز صدیقی مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر صابو صدیق ہال

بمبئی میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کا اہتمام "شاعر" کی جانب سے کیا گیا تھا۔ میں بھی مدعو تھا اور بیگم اعجاز صدیقی کا مہمان تھا۔ جلسے کی صدارت میں نے کی۔ ظ۔ انصاری، راہی معصوم رضا، سلمیٰ صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ سلمیٰ صدیقی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ دوسرے دن سہ پہر کو ان کے دولت کدے پر اُن سے ملنے کا وقت مقرر ہوا۔ صبح سویرے ظ۔ انصاری مجھ سے ملنے میری رہائش گاہ پر آ گئے۔ ان سے رخصت ہونے کے بعد ٹیلی ویژن سنٹر چلا گیا۔ وہاں سردار جعفری اور تبسّم (مشہور فلم / ٹی وی آرٹسٹ) کے ساتھ کرشن چندر کے افسانے "آدھ گھنٹے کا خدا" پر مبنی بمبئی دوردرشن کی تیار کردہ ٹیلی فلم دیکھی۔ وہاں سے راہی معصوم رضا کے یہاں پہنچا۔ وہیں آج کی معروف فلمی اداکارہ دیپتی نول (پرکاش جھا کی سابق بیوی) سے تعارف ہوا۔ اس وقت تک ان کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ڈری ڈری سہمی سہمی سی لڑکی لگتی تھیں۔ راہی کو میں نے بتایا کہ مجھے یہاں سے سلمیٰ صدیقی کے یہاں جانا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں، تمہیں چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے مجھے اپنی نئی سیاہ ایمبسیڈر میں سلمیٰ صدیقی کے گھر پہنچا دیا۔ سلمیٰ بھابھی کہنے لگیں کہ کرشن جی جن دو چار لوگوں کو اپنے آپ سے بہت قریب سمجھتے تھے، ان میں ایک آپ کا نام بھی لیا کرتے تھے۔ کرشن جی کی زندگی میں ان گنت لوگ آئے ہوں گے، بے شمار افراد سے قربت رہی ہوگی، پھر بھی اگر انہوں نے مجھے خود سے قریب سمجھا تو میں اسے ان کی بڑائی اور عظمت کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں! میں نے خواہش ظاہر کی کہ میں کرشن بھائی کا وہ کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں جس میں بیٹھ کر وہ لکھا کرتے تھے۔ سلمیٰ بھابھی نے بتایا کہ وہ کمرہ اس شکل میں باقی نہیں رہا۔ پھر وہ مجھے اس کمرے میں لے گئیں، جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خیال آیا کہ اس مکان کو حکومت کی جانب سے کرشن چندر میوزیم میں تبدیل ہونا چاہیے تھا، مگر وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس دور کے سب سے زیادہ موضوعِ بحث ادیب کی شناخت ہو سکتی۔ بمبئی جیسے مصروف اور بے نیاز شہر میں، یہی کیا کم ہے، کہ وہ مکان، جس میں کرشن چندر رہا کرتے تھے، ان کی بیوی بچوں کے سر چھپانے کے لیے باقی رہا۔

میں کرشن چندر کے سابقہ اسٹڈی روم سے باہر نکلا ہی تھا کہ سلمیٰ بھابھی اشارہ

کر کے مجھے پھر اسی کمرے میں واپس لے گئیں، اور تقریباً سرگوشی کے لہجے میں بولیں: "آپ نے کرشن جی کے انتقال کے بعد پٹنہ سے خط لکھا تھا اور مجھ سے ان کے نکاح نامہ کی نقل مانگی تھی۔۔۔۔" میں حیرت اور ایک طرح کے احساس تکدر کے ساتھ ان کا منہ تکنے لگا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں ہی بول پڑا: "میں تو ساڑھے تین سال سے پٹنہ سے باہر ہوں، کشمیر میں۔ میں نے کرشن بھائی کی وفات کے بعد بلکہ آج تک آپ کو کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر کرشن بھائی کے نام میرا کوئی خط محفوظ ہو تو تحریر ملا کر دیکھ لیجئے۔" ایسا محسوس ہوا کہ ان کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ٹل گیا ہے، لیکن وہ گومگو میں رہیں، شاید سوچ رہی تھیں کہ پھر کس نے یہ فریب کاری کی؟ آج تک میرے لئے بھی یہ ایک معمہ ہے کہ وہ خط میرے نام سے کس نے لکھا۔ ممکن ہے کسی واقف کار صحافی نے کرشن چندر سے میرے قریبی تعلقات کا فائدہ اٹھا کر، میرے نام کا استحصال کرنا چاہا ہو، تاکہ کرشن بھائی اور سلمیٰ بھابھی کی شادی کے سلسلے میں پھر کوئی سنسنی خیز خبر شائع کی جا سکے!

زندگی کے حُسن سے کرشن چندر کا نکاح بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس منکوحہ کو اپنی بھرپور محبت دی۔ وہ مایوس اور دل شکستہ بھی ہوئے کہ زندگی کو بدصورت اور بدمزہ بنانے کی کوششیں ہر طرف سے ہو رہی تھیں لیکن زندگی کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو سے وہ آخر دم تک سرشار رہے۔ ان کا "نکاح نامہ" دیکھنا ہو تو "زندگی کے موڑ پر" دیکھئے، "بالکونی" دیکھئے، "گرجن کی ایک شام" دیکھئے۔ اور ایک معمولی تحریف کے ساتھ "بالکونی" کی ان آخری سطروں پر مضمون کو ختم کرنے کی اجازت دیجئے:

"بہار ضرور آئے گی، ایک دن انسان کی اُجڑی کائنات میں بہار ضرور آئے گی۔۔۔۔ کرشن چندر! تیرے آنسو بیکار نہ جائیں گے!"

● ۱۹۶۷ء

ترمیم و اضافہ ۱۹۹۲ء

اختر قادری

یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد
جیسے کوئی شراب ملادے شراب میں

اختر قادری ان معدودے چند ہستیوں میں ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی اعتبار سے میری ابتدائی زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ اوائل عمر میں کسی کی ذات سے جو تاثرات مرتب ہوتے ہیں وہ عموماً شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں، اور ان میں کوئی تبدیلی شاذ ہی واقع ہوتی ہے۔ میرا ہی شعر ہے:

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری — کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

میں جب کالج کے پہلے سال میں داخل ہوا تو میری عمر یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی رہی ہوگی، دربھنگہ میں چندردھاری متھلا کالج کے قیام کو چند ہی سال ہوئے تھے، اس وقت یہ دربھنگہ شہر کا واحد کالج تھا، اور طلبار کی ایک بڑی تعداد وہاں حصولِ تعلیم کے لئے جمع تھی، اس ابتدائی دور میں کئی ذی علم اساتذہ اس کالج سے وابستہ تھے، اپنی علمیت کے علاوہ جو اساتذہ اپنی پُرکشش شخصیت کے اعتبار سے بھی متاثر کرتے تھے

ان میں ایک تو ہمارے پرنسپل بی۔ ایم۔ کے سنہا تھے، جو بعد میں مگدھ یونیورسٹی کے
وائس چانسلر ہوئے، اب بھی انگریزی میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، پرنسپل سنہا
شیکسپیر کے ماہر سمجھے جاتے تھے، اور ان کے بارے میں طلبہ کا خیال تھا کہ انہوں نے شیکسپیر
ہی کی تقلید میں اپنے بال پیچھے سے بڑھا رکھے ہیں، انگریزی کے ایک اور استاد آر۔ سی۔ پرشاد
تھے جو نئے انداز کے سوٹ پہنتے اور پیچھے ہاتھ باندھ کر ٹہل ٹہل کر پڑھایا کرتے، ان کے
سوٹ کے کالر اُس وقت کے لحاظ سے بالکل نئے فیشن کے ہوتے تھے، اور نوخیز طلباء کے لئے
جو اُن دنوں عموماً قمیص، پاجامے یا دھوتی کرتے میں ملبوس ہوتے، عجب کا باعث ہوتے۔ شعبۂ اردو
فارسی کے اختر قادری نوجوان تھے، خوش اندام، خوش شکل، خوش آواز، خوش اطوار، خوش خط، بس
"خوش" کے ساتھ جتنے الفاظ چاہئے استعمال کر لیجئے، اپنے دائیں پاؤں کے پنجے پر زور دے کر اور الفاظ
کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پڑھایا کرتے تھے، اس طرح کہ ہر لفظ کھلا کھلا یا کھلا کھلا معلوم ہوتا تھا۔

اختر قادری کے گرد ایک رومانی ہالہ سا تھا، سننے میں آتا تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی نے حال
میں دو "اختروں" کو پیدا کیا ہے، جو ادیب اور شاعر بھی ہیں، اچھے استاد بھی، اور کشش انگیز شخصیت
کے مالک بھی۔ ایک اختر اورینوی اور دوسرے اختر قادری۔ ہمارے کالج کے سینیئر طالب علموں میں بھی
ایک رومانی شخصیت تھی جن کا نام منظر حسن تھا۔ وہ کالج کے بڑے ہر دلعزیز، بہت سرگرم، خوش
باش اور ذہین طالب علموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ دربھنگہ شہر کے ایک نہایت معزز گھرانے
کے چشم و چراغ تھے، بڑی شان اور تمکنت سے آتے، انگریزی اور اردو دونوں میں بہت اچھا
بولتے تھے، کئی سال پٹنہ بھی رہ آئے تھے، اس وقت تھرڈ ایر میں تھے، اسکاٹ اور ڈکنس کے
خوبصورت، تازہ تازہ اڈیشن ہاتھ میں لئے رہتے، اور ہم لوگوں پر ان کی انگریزی دانی کا بڑا رعب
پڑتا، اُردو میں افسانے بھی لکھا کرتے تھے، اور دربھنگہ کے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ جب
اختر قادری نئے نئے سی۔ ایم کالج میں آئے اور منظر حسن نے انہیں دُور سے دیکھا تو برجستہ بولے،
"ارے یہ تو قادری ہیں۔ پٹنے میں ہم دونوں ایک ہی لڑکے پر فدا تھے۔"

اختر قادری کا شاگرد بننے سے پہلے میں نے ان کے کچھ منظومات اور افسانے "ندیم"

"سہیل" وغیرہ رسالوں میں پڑھے تھے، "مدینہ" بجنور کے سلور جوبلی نمبر (۳۹ء) میں بھی اُن کا ایک افسانہ "سحرِ فرنگ" شامل تھا، بہار کے باہر کسی اخبار یا رسالے میں بہار کے کسی ادیب یا شاعر کا چھپ جانا اُن دنوں معجزہ ہی سمجھا جاتا تھا، پھر اس وقت اخترؔ قادری دربھنگہ میں موجود واحد شاعر یا ادیب تھے، جن کی نگارشات رسالوں میں چھپا کرتی تھیں، مجھ جیسے ادب کے نئے نئے طالب علم پر اس کا بھی اچھا خاصہ رعب تھا۔

مجھے اب بھی ان کا پہلا کلاس یاد ہے، جب انھوں نے فیضی کی مشہور غزل ؏

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

پڑھائی تھی، ان دنوں فارسی انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی، یعنی اشعار کا مفہوم انگریزی میں بتایا جاتا، مزید وضاحت اردو میں کی جاتی، اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں لکھوا دیا جاتا، قادری صاحب نے جس باریک بینی اور وضاحت کے ساتھ وہ غزل پڑھائی تھی اس کا تاثر اب بھی تازہ ہے۔ وہ کسی لفظ کو گنجلک یا مبہم نہ چھوڑتے تھے، فارسی اشعار کی تفہیم میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی، مجھ میں فارسی زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں بھی بالواسطہ ان کا حصّہ ہے۔

کالج میں داخل ہونے سے پہلے میں نے افسانہ نگاری اور شاعری شروع کر دی تھی۔ اخترؔ قادری سے قربت کی ایک صورت یہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ اپنے شاعر یا افسانہ نگار ہونے کا ان پر اثر ڈالا جائے، اتنی بات تو انہیں میرے ساتھیوں سے معلوم ہو گئی تھی کہ مجھے بھی شعر و ادب کا ذوق ہے، ان کی فرمائش پر میں نے کالج میگزین "سیکر" کے لئے ایک غزل اپنے نام سے اشاعت کے لئے دی، جس کی قادری صاحب نے حسب عادت بے حد تعریف کی، دراصل یہ غزل ۲۴ء کے ایک رسالے میں شائع شدہ کئی ہم طرح غزلوں کے اشعار لے کر بنائی گئی تھی۔ اس میں ایک شعر یگانہ چنگیزی کا بھی تھا، اور ایک عزیز لکھنوی کا بھی، دراصل اس وقت تک مجھے اپنی کوششوں پر اعتماد پیدا نہیں ہوا تھا، میری اس "فریب کاری" کا انتقام قدرت نے اس طرح لیا کہ اس غزل کی اشاعت کے اندازاً دو سال بعد شہر ہی کے ایک مشاعرے میں ایک صاحب نے یہ غزل میری موجودگی میں اپنے نام سے لہک لہک کر سنائی اور خوب داد حاصل کی، میں بیٹھا منہ دیکھا کیا۔

اختر قادری کے زمانے میں کالج کی "بزم ادب" کی طرف سے پہلی بار ایک شاندار انعامی مقابلے اور مشاعرے کا اہتمام ہوا، غالباً اس نوعیت کا کوئی جلسہ اس عظیم الشان طریق پر اس کالج میں پھر کبھی نہیں ہوا، میں نے اس انعامی مقابلے میں کئی کپ حاصل کئے تھے جو آج بھی میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہیں، اس انعامی مقابلے کے لئے جناب منظر حسن نے بھی (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) اپنا ایک افسانہ اور کچھ نظمیں پیش کی تھیں، افسانے تو خیر وہ خود لکھتے تھے، لیکن شاعری ان کے بس کا روگ نہ تھی، انہوں نے یہ نظمیں عبدالعلیم آسی سے لی تھیں جو دربھنگے میں اپنی نئے رنگ کی نظم نگاری اور شاعری کے لئے بہ طور خاص شہرت رکھتے تھے۔ آسی صاحب اقبال اور جوش کے رنگ میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے، اور اپنی روشن خیالی اور بائیں بازو کی سیاست سے وابستگی کے باعث ہم نوجوانوں میں مقبول تھے۔ ملحدانہ خیالات کے مالک تھے گرچہ "مولانا" کہلاتے تھے، مدرسۂ شمس الہدیٰ کے فارغ التحصیل تھے۔ نظموں کے لئے اس انعامی مقابلے میں جو عنوانات دیئے گئے تھے، ان میں ایک عنوان "شاعر" بھی تھا۔ منظر حسن نے اس عنوان کے تحت ایک نظم دی تھی جس کے ایک بند کا ابتدائی حصہ کچھ اس طرح تھا ؂

شاعر ہے جانِ فطرت روح و روانِ فطرت اسرار دانِ فطرت

الفاظ بے زباں کے معنیٰ نکالتا ہے

یہ نظم اپنی ہیئت کی تازگی اور فکر کی پائیداری کے اعتبار سے جاذبِ توجہ تھی، قادری صاحب کو جائز طور پر شبہہ ہوا کہ یہ نظم کسی معتبر شاعر کی ہے، انہوں نے مجھ سے اس شبہہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"جوش کی تو نہیں ہو سکتی، اب کوئی اتنی جرأت بھی کیا کرے گا کہ جوش کی نظم انعامی مقابلے کے لئے پیش کر دے، البتہ احسان دانش وغیرہ کے مجموعوں میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔"

کالج کی لائبریری میں حفیظ، احسان دانش، ساغر اور اس قبیل کے دوسرے شاعروں کے کئی مجموعے تھے وہ میں نے دیکھ ڈالے، لیکن ناکامی ہوئی، ظاہر ہے اس عنوان کے تحت یہ نظم مقابلے میں اول آئی، اور انعام کی مستحق ٹھہری۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ نظم سیماب اکبر آبادی کی تھی جسے آسی صاحب نے جناب منظر حسن کو عنایت کیا تھا۔ یہاں یہ اطلاع بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی

کہ اس کے تیسرے یا چوتھے سال جب پھر انعامی مقابلہ ہوا تو آسی صاحب نے "کاشتکار" عنوان کے تحت جوشؔ کی نظم کے چند اشعار ایک ایسے طالب علم کے حوالے کردیئے جو اب اُسی کالج میں استاد ہے۔ اس وقت اختر قادری صاحب کالج سے جا چکے تھے۔ ورنہ جوشؔ کے باب میں اُنھیں دھوکا دینا آسان نہ تھا۔

اس زمانے کا ایک دلچسپ قصہ سنئے: انٹرمیڈیٹ میں میرے ایک ساتھی تھے، نام؟ (شیکسپیر کا ایک کردار کہتا ہے، نام میں کیا رکھا ہے!) ہم لوگوں نے اُن کا تخلص موجؔ رکھ دیا تھا، مجھ سے عمر میں بلا مبالغہ دس بارہ سال بڑے تھے، بالوں سے بزرگی جھلکنے لگی تھی، میٹرک کے امتحان میں انہوں نے ریکارڈ قائم کیا تھا، یعنی سات آٹھ بار فیل ہونے کے بعد کامیاب ہوئے تھے، اور اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا کہ وہ میرے ہم جماعت ہوگئے تھے، فحشیات اور جنسیات کے ماہر تھے، منشیات سے گہری رغبت تھی، ہنسنا ہنسانا مشغلہ تھا۔ پڑھائی لکھائی سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے اہل تھے۔ اُس دور میں میرا بیش قیمت وقت برباد کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، رات کی آوارہ گردی کے بعد دیر سے گھر لوٹتے اور گھر والے باز پرس کرتے تو کہہ دیتے کہ مظہرؔ کے یہاں اسٹڈی میں دیر ہوگئی۔ ان کے گھر والے میری "فرشتہ صفتی" کے قائل تھے۔ اس لئے ان کا یہ بہانہ عرصے تک کام کرتا رہا، خیر اُن کی کن کن صفتوں کا ذکر کیا جائے۔ ایک ہی صفت یہ تھی کہ ان کا ترنم اچھا تھا، مشاعروں میں لہک لہک کر اچھی خاصی سرمستی سے پڑھتے تھے۔ جگر صاحب کو اس وقت تک میں نے کبھی سنا نہیں تھا، اس لئے خیال تھا کہ جگرؔ صاحب اسی طرح پڑھتے ہوں گے۔ اب مشکل یہ تھی کہ وہ شعر صحیح طور پر پڑھ نہیں سکتے تھے، اس لئے مشاعروں میں جانے سے پہلے ان کی اچھی خاصی ریہرسل کرانی پڑتی تھی۔ انہوں نے کچھ غزلیں میرے ماموں منظور احمد نظرؔ سے لے لی تھیں جو اپنے کو شادؔ کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے، مشاعروں میں نظرؔ صاحب ہی اپنی بخشی ہوئی غزلوں کی داد دینے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ بہرحال جب یہ خزانہ خالی ہوگیا تو میاں موجؔ نے میری جانب رجوع کیا۔ ان کے لئے میں نے بہت سی نظمیں، غزلیں لکھیں، خاص طور پر طرحی غزلیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام مبتدیانہ تھا، لیکن ترنم کے

باعث اچھی خاصی داد پاتا رہا۔ میں ان دنوں مشاعروں میں پڑھنے کے نام سے ہی گھبراتا تھا، مجمع سے مخاطب ہونے کا تصور کر کے ہی پاؤں کانپنے لگتے تھے۔ البتہ سامعین کی صف میں ضرور بیٹھتا تھا۔ ایسی صورت میں اپنا کلام دوسرے کی زبان سے ادا ہوتے اور مقبول ہوتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا تھا۔ ان دنوں تقریباً ہر مشاعرے اور ہر ادبی محفل میں اختر قادری کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ ان کی مقبولیت پر دبے دبے شعرا حضرات میں سرگوشیاں بھی ہوتی تھیں، ان کے کلام میں کیڑے نکالے جاتے تھے، لیکن ان معاصرانہ چشمکوں کے بغیر زندگی میں لطف بھی کیا ہے! تو یہ میرے ہم جماعت موج اور ہمارے استاد پروفیسر اختر قادری اکثر ایک ہی اسٹیج پر دادِ سخن دیتے۔ قادری صاحب اپنے ہونہار شاگردوں کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں، دوسروں سے بھی ان کی "مدح" "قدح بھر" کرتے ہیں، وہ ہر محفل میں موج کی تعریف کرتے رہتے۔ میرے تمام ساتھیوں میں وہ انہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اور مجھے یہ بات اندر ہی اندر کھلتی تھی، کیونکہ جو صفت موج کو قادری صاحب کا منظور نظر بنائے ہوئے تھی، وہ دراصل میری ہی دین تھی۔

پھر ایسا ہوا کہ موج پہلی دفعہ کسی ٹرمینل امتحان میں بیٹھے اور قادری صاحب کو پہلی مرتبہ ان کی نثر دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہر سوال کا جواب انہوں نے دو دو چار چار سطروں میں دے کر چھوڑ دیا تھا، اور وہ بھی غلط سلط، غالباً ۱۸ یا ۱۹ نمبر آئے تھے۔ میں نے دیکھا اس روز قادری صاحب بہت افسردہ اور دل برداشتہ تھے، وہ جانتے تھے کہ میں ہی موج کا سب سے گہرا دوست ہوں، مجھے بلا کر الگ لے گئے، موج کی کاپی مجھے دکھائی اور بڑے آزردہ لہجے میں بولے: "دیکھو یہ لڑکا شعر اتنے اچھے کہتا ہے، مگر امتحان میں کیا بھک کھا گیا ہے"۔ میں تو موج کی "اعلیٰ صلاحیتوں" سے واقف تھا، مگر میں نے صرف اسی قدر عرض کرنے پر اکتفا کی: "جی ہاں! ہے تو یہ افسوسناک، معلوم ہوتا ہے اس وقت اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی!"

موج کی شاعری بہر حال جاری رہی، ایک دن موج بہت خوش خوش یعنی بڑے موج میں تشریف لائے اور کہنے لگے:

"مجھے اچھی سی ایک نظم چاہیے"۔

میں نے پوچھا "کیوں ! کیا مشاعرہ ہے ؟"

بولے "مشاعرہ نہیں چھپنے کے لئے اچھی سی نظم لکھ دو۔ آج قادری صاحب نے بلایا تھا، اور انہوں نے کہا کہ .... رانچی سے کوئی عظیم آبادی صاحب ایک رسالہ نکال رہے ہیں"۔

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "کون ..... سہیل عظیم آبادی صاحب ؟"

"ہاں ہاں وہی ہوں گے ..... تم تو بیچ میں ہی بات اُچک لیتے ہو۔ وہ بہت اچھا رسالہ نکال رہے ہیں۔ قادری صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ اپنی ایک اچھی سی نظم مجھے دے دو تاکہ میں انہیں بھیجدوں"۔

ظاہر ہے کہ میرے دل پر کیا کچھ نہ بیتی ہوگی۔ یہ بات کم و بیش تیس سال پہلے کی ہے۔ اس وقت تک میری کوئی تحریر اشاعت پذیر نہیں ہوئی تھی۔

دربھنگہ میں اختر قادری بہ مشکل تین سال رہے ہوں گے لیکن اس مختصر عرصہ میں انہوں نے اپنی ملنساری، بے تکلفی، علمی ذوق، شفقت، محبت اور خلوص کی بنا پر غیر معمولی ہر دل عزیزی حاصل کرلی تھی۔ قادری صاحب کو گیا کالج میں جگہ مل گئی تو انہوں نے دربھنگہ کو الوداع کہا۔ گیا ان کے آبائی گاؤں کے قریب تھا۔

ایک شفیق، ایک محبوب استاد کی جُدائی ہم سب کے لئے بہت گراں تھی۔ رخصت ہوتے وقت اسٹیشن پر انہوں نے کچھ ایسے الفاظ کہے، جن سے میری بڑی ہمّت بندھی، میں اُن دنوں سخت قسم کی یاسیت کا شکار تھا۔

اختر قادری سے میری قربت، یگانگت اور موانست کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے رخصت ہونے کے دوسرے یا تیسرے دن میں ان کی رہائش گاہ پر گیا، جسے وہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ اس مکان کے پیچھے پھینکی ہوئی ردّی میں سے میں نے کاغذات کے کچھ ٹکڑے چُنے جن میں کچھ ادھوری نظموں کے اشعار، غزلوں کے چند غیر مرتب یا نامکمل شعر لکھے ہوئے تھے۔ ان بظاہر غیر ضروری کاغذات کے ٹکڑوں کو

میں نے عرصہ تک حرزِ جاں بناکر رکھا۔ ۵۱ئہ میں میرے کلکتہ چلے جانے کے بعد میرے کچھ کاغذات ضائع ہوگئے، اس لئے شاید اب یہ محفوظ نہ ہوں۔ ویسے کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے اگر میرے پرانے کاغذات میں یہ ٹکڑے آج بھی مل جائیں۔

اختر قادری کی شاعری زبان کی صفائی اور بے تکلفی کے باعث مجھے پسند آتی تھی، ان کی اس دور کی غزلوں اور سانیٹوں کی زبان عموماً بول چال کی زبان سے کافی قریب تھی اور یہ وصف خاص طور سے مجھے یوں بھی مرغوب تھا کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا تھا۔ اختر قادری کے یہاں معنوی یا فنی ثقالت نہیں ہے، ان کے حرف شاذ ہی دبتے ہیں۔ میں خود اُن دنوں اپنی نوعمری کے راست غیر پیچیدہ جذبات کو سیدھے سادے انداز میں شعری جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا تھا، کسی ایسے رہنما کی تلاش تھی جو خیالات کو سلیقہ اور حُسن سے پیش کرنے کا گُر بتا سکے۔

دربھنگہ میں اُن دنوں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔ حکیم علیم الدین سوزاں سہسرامی اور سید محمد کریم تمنا دربھنگوی کے مخالف حلقے کی صف آرائی مشہور تھی، مشاعرے باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہتے، جن میں اکثر طرحی ہوتے۔ اختر قادری عموماً ان محفلوں کی رونق بنتے "سرود نو" کے کلام کا ایک معتدبہ حصّہ دربھنگہ کے زمانۂ قیام کی یادگار ہے، اس کا پہلا اڈیشن چھپا بھی وہیں تھا۔ گرچہ قادری صاحب کے دربھنگہ چھوڑنے کے کم و بیش تیرہ سال بعد۔ ان کی مندرجہ ذیل غزلیں:

ہر آنکھ ہجر یار میں نم دیکھتا ہوں میں

گذرے نہ دہر میں کبھی دو دن خوشی کے ساتھ

کوئی ہمدم نہ کوئی ہم زباں ہے

وعدہ اُن کا وفا نہیں ہوتا

دل یوں تڑپ رہا ہے تری انجمن سے دور

جنبش سی ہو کے پردۂ محمل میں رہ گئی

شوق نے رسم و رہِ عام سے آزاد کیا
ہنسنا کلی کا گریۂ شبنم سے کم نہیں
دلِ وحشی کو کیا کہیے اگر محوِ فغاں ٹھہرا

دربھنگے میں ہی طرحی مشاعروں کے لئے کہی گئی تھیں، اور طرح کی کامیاب ترین غزلوں میں شمار کی جاتی تھیں، ان میں سے چند طرحوں پر میں نے بھی طبع آزمائی کی تھی۔ دو تین طرحوں پر میں نے دو دو غزلیں کہی تھیں ایک اپنے لئے اور ایک مونج کے لئے، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

اختر قادری ہلکے ترنّم سے اپنے اشعار سنایا کرتے تھے، یعنی ایسا ترنّم جس میں سرگوشی کا انداز ہوتا، ان کا یہ ترنّم انفرادی شان رکھتا تھا۔ اب وقت نے ان کا وہ ترنّم ان سے چھین لیا ہے۔ وقت کے گرد و غبار کے باوجود ان کے یہ اشعار میرے ذہن کے پردے پر آج بھی روشن ہیں، جنہیں مشاعروں میں بے حد داد ملی تھی۔

شباب، موسمِ گُل اور چاندنی راتیں — اسیرِ ہجر کو سامانِ غم ہیں یہ باتیں

اُن سے کرتا ہوں پیار کی باتیں — اُن کا جب سامنا نہیں ہوتا

مرے کام آئی مری ناتوانی — مرا سر ہے کسی کا آستاں ہے
جبینِ شوق جھکتی جا رہی ہے — تصوّر میں یہ کس کا آستاں ہے

مشاعروں سے قطع نظر مجھے اس وقت بھی اختر قادری کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظمیں اچھی لگتی تھیں، ان کی دو نظموں کا تأثر اب تک تر و تازہ ہے۔ ایک تو سانیٹ ہے جو "یہ دنیا" کے نام سے سی ایم کالج کے میگزین "سیکر" میں شائع ہوئی تھی۔ "سرودِ نو" میں یہ سانیٹ "بیانِ شوق" کے عنوان سے درج ہے۔ مجھے یاد آتا ہے ایک دفعہ نظموں کے تلفظ پر گفتگو کرتے ہوئے قادری صاحب نے اسی سانیٹ کے پہلے مصرعے کا حوالہ دیا تھا، کہنے لگے: "میں نے یہ سانیٹ ایک رسالے میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی تو اڈیٹر نے لکھا، "عزیزم! آپکی

نظم تو بہت اچھی ہے، لیکن پہلے ہی مصرعے میں آپ سے ایک بڑی چُوک ہو گئی ہے، اسے دُور کر دیں تو نظم ضرور شائع ہو گی"۔

قادری صاحب نے بتایا" دراصل یہ مصرعہ میں نے بے خیالی میں اس طرح لکھا تھا:

یہ دنیا بے وفا، خود غرض انسانوں کی بستی ہے

"خود غرض" چونکہ یہاں غلط تلفظ کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اس لئے اسے بدل کر یوں کر دیا:

یہ دنیا بے وفا، بے درد انسانوں کی بستی ہے"

دوسری نظم جو اس وقت بہت پسند آئی تھی وہ "سرودِ نو" میں "شیوۂ مردانہ گیر" کے عنوان سے شامل ہے۔ دربھنگہ آنے کے بعد قادری صاحب کا غالباً وہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں انہوں نے یہ نظم پڑھی تھی، اس مشاعرہ میں وہ جناب محسن دربھنگوی کے اصرار پر شریک ہوئے تھے۔ یہ نظم دربھنگہ سے شائع ہونے والے ادبی جریدہ "ہمالہ" کے تیسرے اور آخری شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔

کوندتی ہیں بجلیاں گھر کو جلانے کے لئے
آپ کہتے ہیں مجھے ملہار گانے کے لئے

"سرودِ نو" میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ مندرجہ ذیل تبدیلی کے ساتھ شائع ہوا ہے:

آپ مجھ سے ہیں بضد اشعار گانے کے لئے

مجھے صحیح یاد نہیں، شاید ۴۶ء میں اپنی ۱۸۔۲۰ بالکل ابتدائی غزلیں میں نے ان کے پاس اصلاح و مشورہ کی غرض سے بھیجیں۔ قادری صاحب نے حسبِ معمول انکسار سے کام لیتے ہوئے لکھا کہ آپ میں شعر گوئی کی خداداد صلاحیت ہے وغیرہ وغیرہ اس لئے کلام پر اصلاح کیا معنی! البتہ آپ نے اتنی محبت سے یاد کیا ہے تو کہیں کہیں اپنے خیالات پیش کر دوں گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قادری صاحب نے بہت توجہ سے ان غزلوں کو دیکھا، کہیں کہیں ترمیم کے اسباب بھی بتائے، کچھ اشعار کو قلم زد بھی کیا، ایک حذف کردہ شعر یہ تھا۔

ان دنوں ناراض ہے مجھ سے خدا — روزگار سر خوشی ہے آج کل

اس پر اختر قادری نے اتنا لکھا تھا: "نعوذ باللہ، آپ نہیں جانتے، خدا کی ناراضی کیا ہے!"

قادری صاحب کے بارے میں عام طور پر کہا گیا ہے کہ ان کا تعلق اقبال کے مدرسۂ فکر سے ہے، شاید اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، ان کے کلام پر اقبال کا گہرا اثر بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اپنے کمزور لمحات میں وہ اقبال کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں، اپنی ذاتی زندگی میں بھی وہ مذہب و ملت کی بقا اور ان کے استحکام کی بابت غور و خوض کرتے رہتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ مذہبی رسوم اور احکام کی پابندی کو اپنے لئے جزو لازم قرار نہیں دیتے۔ ان کے بعض افسانوں میں بھی جو کسی زمانے میں لکھے گئے تھے، ایک مخصوص عقیدے سے وابستگی کا اعلان ہوتا ہے۔ اب تو خیر وہ افسانہ نگاری سے تائب ہو گئے ہیں۔ غالباً گذشتہ ۲۵۔۲۶ سال کے دوران انہوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ ایک زمانہ میں وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع کرانا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶۔۴۷ء میں "اُردو ادارہ" دربھنگہ کی جانب سے ہم لوگ بہار کے افسانہ نگاروں کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ اس کے لئے میری درخواست پر قادری صاحب نے اپنا افسانہ "پٹھان کا خواب" بھیجا تھا، جو اپنی ملت سے ان کے تعلق خاطر کو نمایاں کرتا ہے۔ اس "وابستگی" کی شدت نے ان کے فن کو مجروح بھی کیا ہے۔

اس کے بعد قریباً نو دس سال تک اختر قادری سے ملنے ملانے کی کوئی صورت نہیں نکلی۔ نہ پوری ملاقات نہ آدھی ملاقات۔ لیکن ۱۹۵۷ء میں جب ان کا مجموعہ "سرود نو" شائع ہوا تو انہوں نے اس کی ایک جلد اپنے دستخط کے ساتھ مجھے پرویز شاہدی کی معرفت بھجوائی۔ پرویز صاحب اکثر قادری صاحب کی دعوت پر لنگٹ سنگھ کالج مظفر پور کے مشاعروں میں آتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعہ اور پھر دربھنگے میں قادری صاحب کے عزیز شاگرد شاداں فاروقی کے توسط سے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی۔ شاداں فاروقی کالج میں میرے ہم جماعت تھے، اور اب بھی میرے مخلص دوستوں میں ہیں، قادری صاحب سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان ہی کی کوششوں سے محسن دربھنگوی کا مجموعۂ کلام "تلخ و شیریں" منظر عام پر آ سکا۔ اختر قادری کے مجموعے کی اشاعت میں بھی ان کی

کوششوں کو کافی دخل ہے۔

اختر قادری کی خبریں ان کے ایک اور دوست اور ارادت مند مولانا نور اصلاحی سے بھی ملا کرتی تھیں۔ مولانا دربھنگے کی جامع مسجد کے امام تھے، کہولت کی منزلیں طے کر رہے تھے لیکن نوجوانوں میں نوجوان بنے رہتے۔ بڑے بذلہ سنج، شعری اور ادبی ذوق ایسا کہ باید و شاید، غزل ایسی چوکھی کہتے کہ بڑے جغادری قسم کے شاعروں کو پسینہ آجائے، ملحدوں اور رند مشرب نوجوانوں تک کو ان کی محفل میں باریابی حاصل تھی۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، ہمیشہ میرے سلام کا جواب "لال سلام" سے دیتے، بلکہ "لال سلام" پیش کرنے میں پہل کرتے، اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب اشتراکی عقیدہ میرے لئے نامحرم ہو چکا تھا۔ آج جب مولانا نور اصلاحی اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کی باتیں یادوں کے نہاں خانے پر اکثر شب خون مارا کرتی ہیں۔

یادوں کے آئینہ خانے میں اختر قادری کا عکس اپنے جلو میں دوسرے چہروں کی پرچھائیاں بھی لئے چلتا ہے۔ اچھا ہے دوسرے عکس بھی جھلملاتے رہیں۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقریباً نو دس سال تک اختر قادری سے کسی طرح کا رابطہ قائم نہ رہا، لیکن انہوں نے اپنے مجموعے کی اشاعت کے وقت مجھے یاد رکھا، اور اس کی ایک جلد از راہ محبّت عنایت کی۔ میں نے انہیں دنوں اس مجموعے پر ایک تبصرہ لکھا جو ستمبر ۵۷ء کے ماہنامہ "سہیل" گیا میں شائع ہوا۔ اس تبصرے کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی :

> "پروفیسر اختر قادری سے نہ صرف یہ کہ میں نے کالج میں تعلیم حاصل کی ہے، بلکہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ان کے مشوروں سے بھی مستفید ہوا ہوں، اس لئے ان کے مجموعۂ کلام "سرودِ نو" پر اظہار خیال کرتے ہوئے جہاں یک گونہ مسرّت ہو رہی ہے وہاں یہ خوف بھی دامنگیر ہے کہ شاید میں اپنی "عصبیت" کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔"

یہی نہیں، بلکہ جب ۶۲ء میں میرا مجموعۂ کلام "زخم تمنا" شائع ہوا تو اس میں بھی میں نے لکھا :

"میں اپنے محترم بزرگوں اختر قادری، محسن دربھنگوی، جمیل مظہری، اور پرویز شاہدی کا خاص طور پر ممنون ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے مفید مشوروں سے نوازا، اور میری فروگذاشتوں اور خامیوں کو دور کرنے میں مدد دی۔ اب اس مجموعے میں فن اور زبان کی جو ناہمواریاں باقی رہ گئی ہیں ان کی ذمہ داری سرتا سر مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ کچھ اس لئے کہ میں اپنے آپ کو ان حضرات سے پوری طرح فیضیاب ہونے کا اہل نہ بنا سکا اور کچھ اس لیے کہ "صاحب نظر" نہ ہونے کے باوجود میں اتنا سعادت مند نہ بن سکا کہ "دین بزرگاں" کو تمام و کمال قبول کر لوں۔"

۵۸ء کے اوائل میں کمتول (دربھنگہ) کے ایک مشاعرے میں اختر قادری سے طویل مدت کے بعد ملاقات ہوئی۔ بالوں کے ساتھ ساتھ ان کی آواز پر بھی عمر کا اثر آ چکا تھا۔ اختر قادری مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ میں کلکتے سے آیا تھا۔ وہ اسی گرم جوشی سے ملے جس کی ان سے توقع تھی۔ انہوں نے وقت کے بُعد کا احساس نہ ہونے دیا۔

پھر دو تین سال بعد "جمیل مظہری نمبر" کے تعلق سے اختر قادری کا مناظرہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ کئی رسائل نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس "مناظرے" کے سارے تراشے میرے پاس محفوظ ہیں۔ جب یہ طوفان تھما تو میں نے قادری صاحب کو ایک خط لکھا، جس کے جواب میں انہوں نے اس جھگڑے کو ہوا دینے والوں میں سرفہرست ایک طنز نگار شاعر کا نام لیا اور ان کے بارے میں کچھ خاص نوعیت کے انکشافات کئے۔ اس خط کا اقتباس پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۶۷ء میں جب میں گوہاٹی سے تبدیل ہو کر پٹنہ آیا تو اختر قادری سے پہلی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر ہی ہوئی اور اس کے بعد سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ۶۸ء میں جب پرویز شاہدی کا انتقال ہوا تو قادری صاحب نے فوراً مجھے ایک تعزیتی خط لکھا اور مرحوم سے متعلق اپنے اشعار بھیجے، میں نے یہ اشعار بروقت "شاعر" کے لئے بھجوائے جو "گوشۂ پرویز شاہدی" میں شائع ہوئے۔ ان اشعار میں پرویز صاحب سے قلبی خلوص کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ یہی اشعار "مریخ" کے پرویز شاہدی نمبر میں بھی شریک ہیں۔

اختر قادری کی شعر گوئی کی رفتار پہلے بھی بہت تیز نہیں تھی، لیکن اب بالکل سُست ہوگئی ہے۔ افسانہ نگاری سے تو وہ بہت پہلے ہی توبہ کر چکے ہیں، اس لئے اکثر سوچ کر دُکھ ہوتا ہے کہ انہوں نے محض اپنی گُل افشانیٔ گفتار پر ہی قناعت کرلی۔

قادری صاحب ہی کے اصرار اور ان کی حوصلہ افزائی کے باعث میں فارسی میں ایم اے کا امتحان دے سکا، اس کے لئے انہوں نے جو ذاتی دلچسپی لی وہ ان کی شاگرد دوستی اور علم پروری کا واضح ثبوت ہے۔ گذشتہ چھ سال کی یادوں کو یکجا کیا جائے تو یہ داستان اور طویل ہو جائے گی۔ اس داستان کو ختم کرتے ہوئے میں اپنے تعلق سے اختر قادری کے بارے میں آخری لیکن نہایت اہم بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھ سے جو محبت اور خلوص برتا ہے اس کا بہ حیثیت شاگرد بھی مجھ سے کوئی صلہ نہیں چاہا، ان کی عنایتیں یک طرفہ ہی رہیں۔ یہ بے غرضی اور بے لوثی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا آخری اثاثہ ہے!

● ۱۹۷۴ء

خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب ترقی پسند ادب سے آشنائی روشن خیالی اور ذوقِ لطیف کی علامت تھی۔ میں اپنے چھوٹے سے شہر کے بارے میں، جو دراصل ایک قصبے سے زیادہ نہ تھا، آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے روایت زدہ ماحول میں اس وقت کی تازہ ترین ادبی فضا نے کس طرح میری روح سے سرگوشیاں کیں۔ میری عمر یہی کوئی تیرہ چودہ سال رہی ہوگی جب میرے ایک دوست منسوب حسن نے، جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جاں باز کارکن تھے، میرے کان میں مارکسزم، ترقی پسند ادب اور سجاد ظہیر کا صُور پھونکا۔ میرے ایک ماموں محکمۂ ڈاک سے وابستہ تھے، اس لئے بعض اہم رسائل مثلاً ادب لطیف، ساقی، ادبی دُنیا وغیرہ مجھے پڑھنے کو مفت مل جاتے تھے۔ لیکن اس میں باقاعدگی نہ تھی۔ لہٰذا منسوب حسن اور میں نے اُس وقت کے سرکردہ جرائد کی سالانہ خریداری قبول کی؛ مکتبہ اردو لاہور، ساقی بکڈپو دہلی اور دوسرے اداروں سے تازہ ترین مطبوعات منگوائیں، اور اپنے طور پر گردن اکڑا کر چلتے رہے کہ اس نئے ادب کا شناسا ہم دو کے علاوہ پورے شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔

روس سے چھپی ہوئی مارکس اور لینن کی کتابیں میں نے بھی خرید رکھی تھیں، جو سستی تھیں، خوبصورت تھیں اور شیشے کی الماریوں کو سجانے کے کام آتی تھیں، نہ ان کتابوں کو پڑھنے کی فرصت تھی اور نہ انہیں سمجھنے کی صلاحیت۔ لیکن "دانش وری" کی تصدیق کے لئے ان کتابوں پر گفتگو ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شولوخوف کے ناول "اور ڈان بہتا رہا" کی بابت ایک مجلس میں راجندر سنگھ بیدی نے زوردار گفتگو کی، جب کسی نے اس ناول کی جزئیات سے بحث شروع کی تو بیدی کو اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے۔ یہ بات ۴۹ - ۱۹۴۸ء کی ہوگی۔ ویسے ۴۶ - ۱۹۴۵ء تک نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فیض، راشد، میراجی، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، محمد حسن عسکری، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری ـــــ سب ایک ہی خانے میں رکھے جاتے تھے۔ ۱۹۴۵ء تک سردار جعفری اور اُن کے قبیل کے کسی خطیب شاعر کا کلام پنجاب کے رسائل مثلاً "ادبِ لطیف" وغیرہ میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق سرگرم تھا، لکھنؤ اور بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین پُرجوش تھی۔ مجھ جیسا عام قاری نظریاتی مباحث میں اُلجھنے کی بجائے فن پارے کی قدر و قیمت پرکھتا تھا۔ نقاد بھی بڑی حد تک جمہوریت پسند تھا اور اس میں فرقہ وارانہ تشدد پسندی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

آزادی اور تقسیمِ ملک کے بعد نقشہ ہی بدل گیا۔ وضاحت طلب کی گئی کہ تم مہالکشمی پُل کے اُس طرف ہو یا اِس طرف۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ مہالکشمی پُل کے اِس طرف مجھے آنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ ویسے یہ بھی سوچتا رہا کہ کبھی کبھی اُس طرف جانے میں کیا حرج ہے؟ محمد حسن عسکری سے ذہنی قربت کے باعث ترقی پسند دوستوں کی طنز و تشنیع کا نشانہ بھی بنا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اشتراکیت اور ترقی پسندی کے گلیمر نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، مگر اپنے ذہنی اور جذباتی اضطراب سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے دوست نشاط الایمان کو آندرے ژید کے حوالے سے لکھا کہ میں بھی اسی کی طرح عملی جدوجہد میں اس لئے شریک رہا ہوں کہ مجھے زندگی میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جواب میں میرے

ترقی پسند دوست نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

تمہید کچھ طویل ہو گئی ہے۔ لیکن شاید اس ماحول کا ذکر بھی ضروری تھا جس میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے قریب آنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ ایک نوجوان محمد یٰسین تھے، جو رہنے والے تھے شاہو بیگہ، ضلع گیا کے، لیکن اپنے والد کی ملازمت کے باعث دربھنگہ کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ کانگریس کی تحریک سے متاثر تھے۔ تقسیم کے آس پاس اُن کی، مجھ سے اور منسوب حسن سے دوستی ہوئی اور وہ اشتراکیت سے قریب آئے۔ اُنہیں دنوں میری بہن سے انکی شادی بھی ہوئی۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ ایک ترقی پسند ادبی رسالے کا اجرا کیا جائے۔ منسوب حسن اور میرے مشورے سے انہوں نے اپنا ادبی نام منظر شہاب رکھا۔ پہلا شمارہ ہم تینوں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ تھا۔ میرے بڑے بھائی حسن امام درد بھی اس گاڑی کو آگے کی سمت بڑھانے میں مدد دے رہے تھے۔ "نئی کرن" کا پہلا شمارہ جنوری ۴۹ء میں شائع ہوا۔ فروری میں مجھے اور منظر شہاب کو ریلوے کی ہڑتال کے خطرے کے پیش نظر گرفتار کر لیا گیا، حالانکہ ہم میں سے کوئی عملی سیاست میں شریک نہ تھا۔ پولس "نئی کرن" کی بے ضرر کاپیاں اٹھا کر لے گئی۔ منسوب حسن "زیر زمین" چلے گئے۔ ٹھیک انہیں دنوں اسی خطرے کے پیش نظر علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو گرفتار کیا گیا۔ وہ اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سکریٹری تھے۔ ادبی رسائل میں ان گرفتاریوں کا خوب چرچا ہوا۔ انجمن کے جلسوں میں احتجاجی تجویزیں منظور کی گئیں۔ بمبئی میں ایک بڑا احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں کرشن چندر نے ایک خطبہ پڑھا۔ بعض رسائل نے اداریئے لکھے۔ خلیل صاحب کی رہائی تین ماہ بعد ہوئی۔ ہم دونوں ایک ماہ بعد ہی چھوڑ دیئے گئے۔ شاید خلیل صاحب کو زیادہ خطرناک سمجھا گیا، حالانکہ جس طرح اپنے بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح خلیل صاحب کے بارے میں بھی پتہ چلا کہ نہ ان سے خنجر اُٹھ سکتا ہے اور نہ تلوار۔ کہیں وہ بھی عملی جدوجہد میں اسی لئے تو شریک نہیں ہوئے تھے کہ انہیں زندگی میں کوئی معنویت نظر نہ آتی تھی!

خلیل الرحمٰن اعظمی کا بیان ہے کہ ان کی پہلی نظم "نقشِ ناتمام" ۱۹۴۶ء میں ممتاز شیریں

کے "نیا دور" میں شائع ہوئی۔ لیکن میرے ذہن میں وہ نظم نہیں ہے۔ ممکن ہے "نیا دور" کا وہ شمارہ میری نظر سے نہ گذرا ہو۔ در اصل مجھ پر اُن کا رعب اس وقت پڑا جب ان کا کلام "نیا ادب" میں دکھائی دیا۔ "نیا ادب" ترقی پسند مصنفین کا سرکاری ترجمان تھا۔ اور سردار جعفری کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں صرف برگزیدہ، مستند ادیب ہی لکھا کرتے تھے۔ اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ جو اس میں نہیں چھپتا وہ سرے سے ادیب ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں کسی نئے شاعر کا کلام دیکھ کر چہرہ فق ہونا لازمی تھا۔ غالباً یہ ۴۸ء کی بات ہے۔ انہیں دنوں "نگار" میں آتش پر خلیل صاحب کے مضامین چھپ رہے تھے۔ "نگار" وہ رسالہ تھا، جس کا نام آتے ہی ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔ اور جب نیاز فتح پوری نے خلیل صاحب کے بارے میں یہ تعریفی نوٹ لکھا:

"جناب اعظمی جس دقت نگاہ اور امعان نظر سے کام لے رہے، وہ آتش کے بارے میں اس وقت تک کسی صاحبِ علم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔"

تو سب سے پہلے لغت میں "امعان" کے معنی دیکھے۔ اور پھر اپنے دل کو بہلایا کہ نیاز صاحب سٹھیا گئے ہیں، وہ جو چاہیں لکھیں۔ لیکن خلیل صاحب کے طلسم نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میں نے ترقی پسندی کا واسطہ دے کر انہیں خط لکھا کہ "نئی کرن" کے لئے اپنا کلام مرحمت فرمائیے۔ ان دنوں ہم لوگ لفظ "کامریڈ" کھُل جا سم سم کی جگہ استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھے اب ہنسی آتی ہے کہ میں نے کرشن چندر کو بھی خط میں جب "پیارے ساتھی" کہہ کر مخاطب کیا تھا تو میری انا کو کتنی تسکین ہوئی تھی۔ خلیل صاحب ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں شاید بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ اُن کا جواب فوراً آگیا ــــ مختصر، لیکن بڑا پیارا، محبت اور خلوص سے بھرا۔ اس معذرت کے ساتھ کہ فی الحال ان کے پاس کوئی غیر مطبوعہ کلام نہیں ہے، البتہ انہوں نے اپنے تین چار تازہ شعر محض میری دلچسپی کے لئے خط میں لکھ بھیجے تھے۔

۴۹ء کے اوائل میں منظر شہاب مزید تعلیم کے لئے پٹنہ چلے گئے۔ منسوب حسن نے پاکستان کے مشرقی حصے کی جانب رُخ کیا۔ حسن امام درد تلاش معاش میں کہیں اور جا نکلے۔ میں تنہا رہ گیا اور رسالے کی ترتیب کی ذمہ داری میرے ہی سر آپڑی۔ خلیل صاحب کے پہلے ہی خط میں اپنائیت

کی ایسی خوشبو تھی کہ میں نے ان کی معذرت قبول نہ کی اور انہیں دوبارہ لکھا۔ وہ جیل سے واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تازہ نظم "شہید زنداں" بھجوائی جو کمیونسٹ کارکن بھار دواج کی یاد میں لکھی گئی تھی۔ "نئی کرن" کا دوسرا شمارہ نومبر ۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں حصہ منظومات کی ترتیب اس طرح تھی — خلیل الرحمٰن اعظمی، وشوامتر عادل، فارغ بخاری، نریش کمار شاد، افضل پرویز، جمیل ملک، جگن ناتھ آزاد۔ خلیل صاحب کی تحریک پر ان کے دوستوں شہاب جعفری، انجم اعظمی اور جاوید کمال نے بھی اپنا کلام بھجوایا تھا۔ لیکن اس وقت ان سب کے کلام سے "نو آموزی" نمایاں تھی۔ اور اسی لئے "نئی کرن" میں ان کی اشاعت نہ ہو سکی۔ خلیل صاحب اپنے دوستوں، ہم مشربوں اور نئے لکھنے والوں کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔

خلیل صاحب سے جذباتی لگاؤ کی ایک اور وجہ تھی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی دربھنگے میں ہی قیام پذیر تھے، اور ایک مذہبی پندرہ روزہ "الہدیٰ" کی ادارت کرتے تھے۔ اُن کے اداریوں میں ادبی چاشنی ہوا کرتی تھی، اور اس لئے ان کی نثر مجھے پسند آتی تھی۔ اچھی نثر ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ ایک ملحد اور ایک مولوی کا یہ ربط خاصا دلچسپ تھا۔ پرواز اصلاحی کے ساتھ خلیل صاحب کے تعلق سے اکثر گفتگو ہوتی تھی۔ گذشتہ دنوں ۲۷۔ ۲۸ سال کے لمبے وقفے کے بعد بمبئی میں پرواز اصلاحی سے اُس جلسے میں ملاقات ہو گئی جو اعجاز صدیقی کی پہلی برسی کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ ہم دونوں جس والہانہ پن سے ملے، اس جذبے میں قدر مشترک خلیل الرحمٰن اعظمی تھے۔ جتنا وقت بھی ان کے ساتھ گذرا وہ طاقِ دل کو خلیل صاحب کی یادوں سے سجانے میں گذرا۔ پرواز صاحب ایک عرصہ کے بعد علی گڑھ گئے تھے اور کئی دن تک خلیل صاحب کے ساتھ رہنے کے بعد، جس صبح علی گڑھ سے رخصت ہوئے اسی دوپہر خلیل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پرواز صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میری ابتدائی ادبی زندگی کے نقوش میں یہ نقش نمایاں ہے کہ مارچ ۵۰ء کے "جادہ"

"بھوپال" (مدیر کوثر چاند پوری) میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور میری غزلیں اور دسمبر ۵۱ء کے "جائزہ" کراچی میں ہم دونوں کی نظمیں ایک ساتھ آگے پیچھے شائع ہوئیں تو مجھ میں بڑی خوداعتمادی پیدا ہوئی۔ یہ غزلیں اور نظمیں ہم دونوں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

۵۰ء کے اواخر تک کبھی کبھی خلیل صاحب سے میری خط وکتابت رہی۔ فروری ۵۱ء میں "نئی کرن" کا تیسرا اور آخری شمارہ شائع ہوا۔ پھر میں امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا اور بی۔اے کی تکمیل کر کے ستمبر میں کلکتہ چلا گیا، اردو صحافت سے رشتہ جوڑنے کے لئے۔ میں کلکتہ میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند مصنفین کی مشترکہ انجمن کا سکریٹری رہا۔ جو ۵۵ء تک فعال تھی اور ۵۶-۵۷ء تک گھسٹتی رہی۔ علی گڑھ میں انجمن کے جلسے شاید کچھ اور بعد تک ہوتے رہے۔ ان میں شرکت خلیل صاحب کی بھی ہوتی رہی لیکن اس تحریک کے مدعیوں اور رہنماؤں کی کٹر پسندی، ادعائیت، حلقہ بندی اور تنگ نظری نے سب کو کافی پہلے سے بددل کرنا شروع کر دیا تھا۔ خلیل صاحب ترقی پسندی کے سحر سے آزاد ہونے والے پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ گرچہ اس کا باقاعدہ تحریری اظہار انہوں نے بعد میں کیا۔ میں نے اگست ۵۲ء میں کلکتہ کی انجمن میں ایک بحث کے دوران ایک مضمون پڑھا تھا۔ جس میں سخت الفاظ میں نام بہ نام اہم ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے قول وفعل کے تضاد اور ان کی ادبی سیاست کو ظاہر کیا گیا تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی شاعر اور نقاد کی حیثیت سے دو چار سال کے اندر ہی معتبر تسلیم کر لئے گئے اور ان کی نثری اور شعری تخلیقات ارباب نقد ونظر کی توجہ کا مرکز بننے لگیں۔ انہیں جائز طور پر ہندوستان میں نئی غزل کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں جو بصیرت اور نظر ملتی ہے، خیالات کی جو صفائی اور وضاحت اور اندازِ نظر کی جو معروضیت ہے، وہ ہماری نئی تنقید کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

میں ۵۳ء میں معمول کے مطابق موسم گرما کی تعطیلات میں کلکتے سے اپنے وطن آیا تو کہیں سے خبر ملی کہ آج کل خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے کسی دوست کے یہاں دربھنگہ ضلع کے ایک گاؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں (یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دربھنگہ ضلع نہیں بلکہ مظفر پور ضلع کا ایک گاؤں ہے

جو دربھنگہ ضلع کی سرحد پر واقع ہے) ہم لوگوں نے دربھنگہ شہر کے ٹاؤن ہال میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح خلیل صاحب کو اس مشاعرے میں لایا جائے۔ لیکن اُن تک پیغام نہ پہنچ سکا۔ اگر پیغام پہنچ جاتا تب بھی شاید وہ مشاعرے میں شرکت نہ کرتے۔ خلیل صاحب نے اس گاؤں میں قیام کا تاثر اپنی نظم "متھلا دیش" میں پیش کیا ہے، جو اُن کے پہلے مجموعہ کلام "کاغذی پیرہن" میں شامل ہے۔

خلیل صاحب شروع سے یار باش رہے ہیں۔ اُن کے خلوص اور محبت سے فائدہ اُٹھانے والوں کی کمی نہیں رہی۔ ان کے بارے میں اطلاع ملی کہ اُن کے اسی دوست نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور جو ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اُنہیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ ایک بازاری عورت کے سلسلے میں وہ بدنام ہوئے اور کئی ماہ تک علی گڑھ سے دور شمالی بہار کے ایک دور اُفتادہ گاؤں میں اپنے اُسی دوست کے یہاں رُوپوش رہے۔ اس دوست کے نام سے خلیل صاحب نے بعض خوبصورت غزلیں چھپوائیں، ایک غزل کراچی سے شائع ہونے والے جریدے "روحِ ادب" نے اپنے انتخاب "۵۳ء کا بہترین ادب" میں بھی شامل کی۔ میں دوست کے نام سے واقف تھا۔ اور ان کے نام سے چھپی ہوئی غزلیں دیکھ ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پردۂ زرنگاری میں کون معشوق ہے۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب دو تین سال بعد وہ مجھ سے کلکتہ میں ملے اور انہوں نے "اپنی" اچھی بھلی غزلوں کے اشعار ناموزوں کر کے سنائے۔

رشید احمد صدیقی جو خلیل صاحب کے نہ صرف استاد تھے، بلکہ ان کے مربّی بھی، ہر چند اُن کی ان لغزشوں سے خوش نہیں تھے، لیکن وہ جوہرِ قابل کی پرکھ بھی رکھتے تھے۔ جیسے ہی علی گڑھ میں لکچرار شپ کی جگہ نکلی، انہوں نے خلیل صاحب کو بلوا لیا۔ اور اس طرح خلیل صاحب ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہوئے ــــ ادبی اعتبار سے بھی۔

۵۴ء میں علی گڑھ سے ایک نیا رسالہ "فکر و نظر" نکلا جس میں خلیل صاحب کا ایک مضمون جوش کی شاعری کے خلاف شائع ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں بعد جوش ایک مشاعرہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کشتی کی ایک شام پرویز شاہدی

کے گھر پر گذری۔ اس مختصر محفل میں اوروں کے علاوہ جمیل مظہری اور رضا مظہری بھی تھے۔ مگر انہوں نے صرف بانی پر ہی اکتفا کی۔ میں نے دوران گفتگو جوش صاحب سے خلیل صاحب کے مضمون کا ذکر کیا۔ کہنے لگے میرے خلاف مضمون لکھنے کے لئے امریکہ سے پیسے ملے ہیں۔ اگلے سال جوش ہمیشہ کے لئے پاکستان چلے گئے۔ اگر خلیل صاحب کو پیسے کا ایسا ہی لالچ ہوتا تو انہوں نے جوش کی تقلید نہ کی ہوتی؟

کم و بیش دس سال تک خلیل صاحب سے میری خط و کتابت نہیں ہوئی، لیکن اُن کی تحریروں کے ذریعے اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ اُن کے بارے میں علی گڑھ سے خبریں بھی ملتی رہیں۔ مارچ ۱۹۶۰ء میں، جب میں کٹک میں تھا، مجھے آل انڈیا ریڈیو کے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے اور اس سے زیادہ خلیل صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے دہلی سے انہیں خط میں غالب کا پٹا پٹایا یہ شعر لکھ بھیجا ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

خلیل صاحب نے فوراً جواب میں عندلیب شادانی کا شعر لکھا ؎

میں تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کہیں بھولا ہے نشیمن اپنا

اور بڑی گرم جوشی سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

خلیل صاحب ان دنوں آنند بھون، دودھ پور میں رہتے تھے (بعد میں اسی مکان میں وحید اختر رہنے لگے تھے) ان کے ہمسایہ قاضی عبدالستار تھے، جو تا حال اسی مکان میں رہے۔ میں جب آنند بھون پہنچا تو شہریار کو اپنا منتظر پایا۔ خلیل صاحب یونیورسٹی گئے ہوئے تھے۔ اُن دنوں شہریار، خلیل صاحب کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا تھا قاضی عبدالستار اپنے وطن روانہ ہونے کے لئے اپنا مکان مقفل کر رہے تھے۔ شہریار نے ان سے میرا تعارف کرایا۔

انہوں نے میرے سلام کا جواب تو دیا، لیکن بڑی بے دلی سے ــــ اس طرح جیسے میرے نام سے واقف نہ ہوں۔ کئی سال بعد جب میں پٹنہ میں تھا، انہوں نے خود میرے گھر آنے کی زحمت کی۔ لیکن اس کا تعلق علی گڑھ کی یادوں سے نہیں ہے۔

خلیل صاحب کے ساتھ میرا قیام مختصر تھا۔ تین چار دن۔ لیکن اس دوران میں جیسے میں نے برسوں کی جدائی کی تلافی کرلی۔ خلیل صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ یونیورسٹی میں موسم گرما کی تعطیلات ہوچکی تھیں اس لئے اکثر اساتذہ باہر جا چکے تھے۔ پھر بھی ان کے ساتھ علی گڑھ کی کئی شخصیتوں سے ملنا ہوا ــ مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، منیب الرحمٰن، لائبریرین جناب محمد بشیر، جو دراصل اڑیسہ کے رہنے والے تھے، مگر انہوں نے علی گڑھ کو ہی اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ یہ امجد نجمی کے بچپن کے ساتھیوں میں تھے؛ یہیں اسسٹنٹ لائبریرین مشتاق صاحب مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی، جو میرے وطن سے قریب سمستی پور کے رہنے والے تھے۔ وہ اس وقت شبلی کے مکاتیب مرتب کر رہے تھے۔ بعد میں یہ مکاتیب کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس وقت مولانا آزاد لائبریری کی عمارت نئی نئی بنی تھی۔ اور پرانی لائبریری سے اس میں کتابیں منتقل ہو رہی تھیں۔ خلیل صاحب کے گھر پر ان کا ذاتی کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالوں کی فائلیں بطور خاص اہتمام سے رکھی ہوئی تھیں۔ چونکہ مجھے خود رسالوں کی فائلیں محفوظ رکھنے کا شوق رہا ہے۔ اس لئے میری توجہ لازمی طور پر اس جانب گئی۔ خلیل صاحب کے مکان سے سادگی، لیکن نظم اور سلیقہ کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت ان کا پہلا بیٹا کامران ایک سال کا تھا۔ اسی لڑکے کی ولادت پر خلیل صاحب نے اپنی خوبصورت نظم "میلاد" لکھی تھی۔ اس ملاقات میں خلیل صاحب کی شخصیت کی سادگی اور دلفریبی اور ان کے علم کی ہمہ جہتی سے براہ راست واقف ہونے کا موقع ملا۔

خلیل صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ مجہول سے مجہول، معمولی سے معمولی لکھنے والوں کی تحریریں بھی توجہ سے پڑھتے تھے۔ اس کے بارے میں ایک رائے قائم کرتے تھے۔ اور اس کا نام حافظے میں محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے حافظے کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ایک زمانے میں مجھے بھی چسکا تھا کہ میں رسالوں میں شائع ہونے والی زیادہ سے زیادہ تحریریں پڑھوں اور اپنے وقت کے تمام

ادبی رسائل میں شائع ہونے والی نگارشات سے باخبر رہوں۔ ایک بار کسی رسالے میں اُڑیہ افسانہ نگار سُریندر مہنتی کے ایک افسانے کا ترجمہ شائع ہوا۔ یہ ترجمہ بدیع مشہدی (موجودہ بدیع الزماں) نے کیا تھا۔ اُن سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس ترجمے کا ذکر کیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ غیر معروف رسالہ بھی میری نظر سے گذرا تھا۔ حسن نعیم بھی وہاں موجود تھے، کہنے لگے "خلیل الرحمٰن اعظمی کے بعد اگر کوئی نئی سے نئی تحریروں سے واقف رہتا ہے تو وہ مظہر امام ہیں"۔ شاید حسن نعیم نے یہ بات محض میری دلداری کے لئے کہی تھی، لیکن مجھے اس Compliment سے واقعی مسرت ہوئی۔ خلیل صاحب کے ساتھ کسی بھی حیثیت سے میرا نام وابستہ ہونا میرے لئے واقعی فخر کی بات تھی۔

۱۹۶۱ء میں جب میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام "زخمِ تمنّا" کی ترتیب میں مصروف تھا، میں نے خلیل صاحب کو ایک خط لکھا کہ وہ میری شاعری کے بارے میں ایک مختصر رائے لکھ کر بھیجدیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، اس سے اس تعلقِ خاطر کا پتہ چلتا ہے، جو انہیں مجھ سے تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> "مظہر امام ان معدودے چند شعرا میں ہیں، جنہیں اپنا ہم عصر اور ہمسفر سمجھنے میں مجھے ہمیشہ مسرت ہوئی ہے۔ ان کے شعری مزاج کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا ہے مجھے اس دریا کا خیال آیا ہے جو میدانوں میں بہتا ہے اور اس کی چال میں سکون اور گمبھیرتا ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں تیز روشنی اور تیز رنگوں کی چونکا دینے والی شاعری نہیں، ان کے یہاں سلونا پن ملتا ہے، جو زمین سے قربت اور اپنائیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے نوجوان شاعر طوفان کی طرح آئے لیکن ان کی آوازیں بہت جلد فضا میں کھو گئیں۔ مظہر امام نے آہستہ آہستہ اپنی آواز کا جادو جگایا، لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا فن دیرپا ثابت ہوگا۔
>
> جو شاعر ایسے اشعار کہہ سکتا ہو ۔
>
> شاخِ گُل سے لپٹ کے روتی ہے اُس چمن کی ہوا کو کیا کہیے

اس سے دوستی کا کون آرزومند نہ ہوگا۔"

خلیل صاحب بہار سے باہر کے پہلے ناقد تھے جنہوں نے جمیل مظہری کی شاعری پر ایک طویل مضمون لکھا، اور انہیں جوش پر فوقیت دینے کی کوشش کی۔ یہ مضمون خلیل صاحب کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے "فکر و فن" میں شامل ہے۔ خلیل صاحب کو بہار کے لکھنے والوں سے ایک اُنسیت رہی ہے۔ شاید اسی قُربت کا اثر تھا کہ وہ بہار کے کسی ادیب یا شاعر کے غلط اندازِ نظر کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ انہیں محبوب خزاں کے ایک مضمون (بہ عنوان "مگر سچ کون بولے گا") سے اختلاف تھا، جو "سوغات" کے جدید نظم نمبر میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے "سوغات" کے اگلے شمارے میں اس مضمون کا جواب "اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخمِ جگر دیکھیں گے" چھپوایا۔ خلیل صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ اُنہوں نے محبوب خزاں کو بہار کا باشندہ سمجھ لیا۔ شاید اس لئے کہ موخرالذکر نے اپنے مضمون میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی وکالت کی تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ محبوب خزاں کے غلط بیانات کے باعث بہار کے تمام نئے لکھنے والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ انہوں نے اپنے جوابی مضمون میں لکھا:

> "بہار میں بسنے والے بعض نوجوان ادیب جنہیں پچھلے تین چار سال سے کچھ لکھنے لکھانے کا شوق ہوا ہے، وہ بجائے اس کے کہ جم کر ادب کا باضابطہ مطالعہ کریں اور محنت و ریاضت سے جی نہ چُرائیں، بس اسی پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں کہ نئی اور چونکا دینے والی باتیں کریں اور اپنی دانست میں انہیں "سچ" کہہ کر پیش کریں۔"

مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ بعض دوستوں سے ذکر آیا تو اُنہوں نے کچھ زیادہ ہی ناگواری کا اظہار کیا۔ میں نے اپنے مضمون "آتی جاتی لہریں" (شب خون، ستمبر ۶۷ء) میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

> "خیر، اس سے قطع نظر کہ ہر اچھا اور بڑا ادب نئی اور چونکا دینے والی

باتیں پیش کرتا ہے، یہ کون سی منطق ہے کہ اگر اعتراض یا تنقید کسی
ایسے لکھنے والے کی طرف سے ہو، جو اتفاق سے بہار میں پیدا ہوا ہو،
تو پورے صوبے اور اس صوبے کے لکھنے والوں کو ہدف ملامت بنایا جائے۔"

اپنے اس مضمون میں خلیل صاحب کے ایک مطبوعہ خط کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں کی ایسی رائیں پیش کیں جو اچھی خاصی سخت تھیں۔ خلیل صاحب غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ شاید انھیں مجھ سے اس کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے جائز طور پر اس کا برا مانا۔ دوستوں کی محفل میں ذکر آیا۔ پھر جب اختر اُورینوی سے رشید احمد صدیقی کے مکان پر ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے بر سبیل تذکرہ اس سلسلے میں بھی شکایت کی۔ مجھے اختر صاحب نے علی گڑھ سے لوٹنے کے بعد اطلاع دی تو میں نے فوراً خلیل صاحب کو خط لکھا، کیونکہ میرا مقصد دل آزاری یا قطع محبت نہیں تھا۔ خلیل صاحب نے جواب میں اپنی شکایت کا اعادہ تو کیا، لیکن کسی تلخی کے ساتھ نہیں، ایک فراخ دل دوست کی طرح!

اس کے کچھ ہی دنوں بعد خلیل صاحب پٹنہ آئے اور حسب معمول اختر اورینوی کے یہاں ٹھہرے۔ بہار کی ایک یونیورسٹی کے لئے بہار پبلک سروس کمیشن کی جانب سے اردو کے دو لکچراروں کا انتخاب ہونا تھا۔ خلیل صاحب بھی ایک ایکسپرٹ تھے۔ میرے ایک عزیز دوست، جو ہر چند اپنی صلاحیتوں کے پیش نظر، واقعی اس جگہ کے مستحق تھے، میری سفارش چاہتے تھے۔ اس کے لئے اُنہوں نے مجھ سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ جس دن خلیل صاحب پٹنہ پہنچے، میں بخار میں مبتلا تھا۔ میرے عزیز دوست مجھے یاد دلانے آگئے۔ میں اسی حالت میں خلیل صاحب کے پاس گیا۔ تھوڑا سا احساس تھا کہ شاید کچھ تلخی باقی ہو۔ مگر ان کی خندہ روئی، بے تکلفی اور اخلاص نے سارے خدشات پس پشت ڈال دیئے۔ اپنے عزیز دوست کی سفارش میں جو میں کہہ سکتا تھا، وہ میں نے کہہ ڈالا۔ وہ میرے اُمیدوار کے نام اور کام سے حسب توقع واقف تھے۔ خلیل صاحب کو بلاشبہ اُردو کے سب سے باخبر ادیب ہونے کا فخر حاصل تھا۔

دوسرے دن انٹرویو تھا۔ اسی دن سہ پہر کو ان کے اعزاز میں نئے ادیبوں اور شاعروں نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس دن میرا بخار بہت تیز تھا، اور میں اس جلسے میں

شریک نہ ہوسکا۔ خلیل صاحب نے اس جلسے میں بڑی معرکہ آرا تقریر کی۔ کلاسیکی ادب، ترقی پسندی، جدید حسیت ــــــ سب پر اظہار خیال کیا۔ ان کے قاموسی علم کے سبھی قائل ہو گئے۔ میرے بعض "کرم فرماؤں" نے میری عدم موجودگی کو یہ رنگ دیا کہ مظہر امام اپنے نظریاتی اختلاف کی بنا پر جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان "کرم فرماؤں" نے یہ بات دور دور تک پھیلائی۔ محمود ہاشمی نے بھی اپنے ایک مضمون مطبوعہ "شب خون" کے ذریعہ اس جلسے میں میری عدم شرکت کی اطلاع دی۔ مجھے خود آج تک پتہ نہ چل سکا کہ خلیل صاحب سے میری کون سے "نظریاتی اختلافات" تھے۔ خلیل صاحب کو اطلاع مل گئی کہ میری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ شام کو وہ اختر اور بیوی کے ساتھ عیادت کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ میرا کام ہو گیا ہے۔

۶۹ء کے اواخر میں خلیل صاحب نے فضیل جعفری کے خلاف ایک مضمون "صحافتی تنقید" علی سعید شیرازی کے فرضی نام سے "شب خون" میں چھپوایا۔ بہت دنوں تک پتہ نہ چل سکا کہ اصل مصنف کون ہیں۔ اس مضمون پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ اس سلسلے میں میرا بھی طویل مراسلہ چھپا تھا۔ ایک صاحب نے "شب خون" میں ہی ایک خط چھپوایا اور تیقن سے کہا کہ یہ مضمون مظہر امام کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان صاحب نے میرے پاس رسائل کے بعض وہ تراشے دیکھے تھے جن کے حوالے زیر تذکرہ مضمون میں شامل ہوئے تھے۔ اس الزام سے مجھے خوشی ہوئی کہ لوگ خلیل صاحب کی تحریر پر بھی میری تحریر کا شبہ کر سکتے ہیں۔

۶۹ء میں ہی ریڈیو کشمیر کی جانب سے سری نگر میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس میں کئی سرکردہ شعرا، شریک ہوئے۔ ایک محفل میں جہاں شعر و شراب دونوں کا دور چل رہا تھا، فراق صاحب کی کسی غیر معقول بات سے مشتعل ہو کر خلیل صاحب نے اپنے مزاج کے برخلاف انہیں کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ فراق صاحب کئی دنوں تک بڑے گھبرائے گھبرائے سے رہے۔ اور شاید وہ اس واقعے کو عرصہ تک نہ بھول پائے۔ ۷۳ء میں کانپور کے ایک مشاعرے میں مجھے شرکت کا موقع ملا۔ میں، شاذ تمکنت، زبیر رضوی، فراق اور کئی دوسرے شعرا، ایک ہی جگہ ٹھہرائے گئے تھے۔ "شاہکار" کے فراق نمبر کے لئے فراق کے کلام کا ایک بہت ہی عمدہ انتخاب

خلیل صاحب نے کیا تھا۔ فراق صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے اس انتخاب کی تعریف کی۔ کہنے لگے: "اس سے اچھا انتخاب میں کرتا" اب میں ان سے کیا کہتا کہ اگر آپ اپنے اشعار کا انتخاب کرنے کے اہل ہوتے تو اپنے نام سے اتنی لمبی لمبی غزلیں کیوں چھپواتے!

میں ۷۴ء میں بہت سخت بیمار ہوا۔ نقاہت حد درجہ بڑھ گئی اور عرصہ تک چلنے پھرنے سے معذور رہا۔ خلیل صاحب کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ خود بھی تشخص کے مرض میں کافی دنوں مبتلا رہے تھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ وہ یونیورسیٹی کے کسی کام سے گیا آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں ان سے مل لوں، کیونکہ خود ان کی صحت مزید سفر کر کے پٹنہ آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اتنا وقت نہ تھا کہ میرا جواب انہیں پہنچ سکتا۔ میں دل مسوس کر خاموش ہو گیا کہ خلیل صاحب سے ملاقات کی یہ سعادت اپنی علالت کے باعث حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن میں خوش نصیب تھا۔ ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ خلیل صاحب وہاب اشرفی کے ساتھ رکشے سے اتر کر میرے غریب خانے پر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی اس غیر متوقع آمد پر میں آبدیدہ ہو گیا۔ کہنے لگے: "گیا آیا تو وہاب نے بتایا کہ خود آپ بہت علیل رہے۔ بس آپ کو دیکھنے چلا آیا۔" خلیل صاحب کی اس اچانک تشریف آوری اور ان کے خلوص، نیکی اور شرافت کے نقوش آج بھی تر و تازہ ہیں۔ شخصیت اور کردار میں بڑائی اخلاقی قدروں کے تحفظ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

میں ۷۵ء کے اواخر میں سری نگر آ گیا۔ مئی ۷۶ء میں مجھے ریاستی سرکار کی عنایت سے جو فلیٹ رہنے کو ملا، وہ کمال احمد صدیقی کے فلیٹ کے ٹھیک اوپر تھا۔ کمال احمد صدیقی، خلیل صاحب کے ہم زلف ہیں۔ کمال صاحب اور مسز شاہدہ کمال سے خلیل صاحب کا ذکر اکثر آتا رہتا۔ جن میں مایوس کن بیماری کی خبریں ہی ہوتی تھیں۔ خلیل صاحب کو لیوکیمیا یعنی بلڈ کینسر کی بیماری تھی۔ اس بیماری میں خون کے سرخ خلیے بننا بند ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ سفید خلیوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ میرے سامنے تین حادثے تھے۔ سب سے پہلے اس مرض کے نام سے ۵۴ء میں آشنا ہوا۔ کلکتے میں ل۔ احمد اکبر آبادی کا ایک لڑکا اسی ادارے میں تعلیم پا رہا تھا، جس سے میں وابستہ

تھا۔ بہت ذہین، خوش شکل، شائستہ اور صحت مند لڑکا تھا۔ اچانک اس مرض کا شکار ہو گیا۔
اور تین ماہ کے اندر ہی وہ اس دنیا سے چل بسا۔ دوسرا حادثہ ارشد کاکوی کا تھا۔ وہ کسی طرح اپنی
عمر کے دو تین سال بڑھا لے گئے۔ مرحوم صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے بھائی احتشام الدین احمد
کی لڑکی اسی مرض میں مبتلا ہوئی۔ بہت علاج کیا گیا۔ اسے فرانس بھی لے گئے جہاں اس بیماری
کے علاج کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن فرانس سے اس لڑکی کی لاش بذریعہ طیارہ دہلی لائی گئی۔ مجھے
یقین تھا کہ خلیل صاحب جانبر نہیں ہو سکتے۔ جب تک وقت گذر رہا ہے، ان کا وجود غنیمت ہے۔
پروفیسر شپ کے سلسلے میں ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی وہ محکمۂ تعلیم پر ایک بدنما داغ ہے۔
میری خوش نصیبی یہ ہوئی کہ خلیل صاحب تبدیلیٔ آب وہوا کے لئے سری نگر تشریف لائے اور کمال صاحب
کے یہاں تقریباً چار ماہ قیام پذیر رہے۔ جس دن وہ پہنچے، نقاہت کا غلبہ تھا۔ اچھی طرح چلنے
پھرنے کے لائق نہ تھے، لیکن یہاں کی آب وہوا نے چند ہی دنوں میں بہت خوشگوار اثر ڈالا۔
چہرے پر شگفتگی آئی۔ تھوڑی دور پیدل سیر بھی کر لیتے۔ پھر آہستہ آہستہ پیدل چل کر ٹیلی ویژن سنٹر
بھی آجاتے۔ جو ان کی رہائش گاہ سے کم از کم ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم سب نے
ان کی دلدہی میں اپنے طور پر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کے۔ کے نیر نے ریڈیو میں، میں نے
ٹیلی ویژن میں، اور پروفیسر شکیل الرحمٰن نے یونیورسٹی میں کوئی نہ کوئی موقع دیکر انہیں برابر مصروف
رکھا۔ اور انہیں علالت کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں نے کچھ خوش جمالوں سے بھی بہ طور خاص متعارف
کرایا، تاکہ ان کا جمالیاتی احساس تازہ دم ہو۔ جب اگست ۷۷ء کے وسط میں وہ علی گڑھ
واپس لوٹے تو کافی چاق و چوبند تھے۔ دوست انہیں صحت کی مبارکباد دیتے رہے۔ کشمیر سے
واپس جانے کے بعد انہوں نے مجھے ایک خط میں یہ خوش خبری دی:

"اب کمزوری بالکل نہیں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام معمول کے مطابق
ہو رہا ہے۔"

زندگی ہم سب کو کیا کیا فریب دیتی ہے!
وہ یکم جون ۷۸ء کی شام تھی۔ سری نگر میں میری رہائش گاہ پہ غیاث احمد گدی، رضوان احمد،

اعجاز علی ارشد اور قدوس جاوید جمع تھے۔ سردار جعفری بھی اسی شہر میں آئے ہوئے تھے اور ایم ایل اے ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ اُن سے ملنے کا پروگرام تھا۔ ہم لوگ وہاں جانے کے لئے سیڑھیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ شمیم احمد شمیم کی ہمشیرہ رقیہ سعید ملیں۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا۔ "خلیل صاحب کے بارے میں اطلاع ملی؟" میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کمال احمد صدیقی اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ مسز کمال سے یہ بات پوشیدہ رکھی گئی۔ ان کے گھر کامران کا تار آچکا تھا، لیکن ان کے بچوں نے اسے چھپا دیا تھا۔ مسز کمال سے اتنا کہا گیا کہ خلیل صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور پھر انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔ وہ دونوں دوسری صبح علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے جیسے ہی اُوپر آکر اپنی بیوی مبینہ کو اس حادثے کی اطلاع دی، وہ بیخ پڑیں اور پھر دوسرے تنہا کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں اپنا غم بھول گیا، اور ان کی بے حال ہوتی ہوئی کیفیت پر انہیں دلاسہ دینے لگا۔ وہ خلیل صاحب کو بالکل اپنا بھائی سمجھنے لگی تھیں۔ ان کا اب بھی کہنا ہے کہ ادیبوں میں وہ جتنی خلیل صاحب سے متاثر ہوئی ہیں، کسی اور سے نہیں ہوئیں۔ حالاں کہ انہیں اردو کے بہت سے بڑے نامور ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔

کافی دیر بعد میں اور غیاث احمد گدی، سردار جعفری کے پاس محض اس حادثے کی خبر دینے گئے۔ وہاں خلیل صاحب کی شخصی خوبیوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم سب کمال صاحب کے یہاں آئے۔ جعفری صاحب کو ہم نے بتا دیا تھا کہ مسز کمال کو اس حادثے کا علم نہیں ہے۔ انہوں نے کمال صاحب کو الگ لے جا کر تعزیت کی۔ لیکن مسز کمال کو دلاسہ دیتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی آج ہم میں نہیں ہیں۔ آج کون سا ادیب یا ناقد ہے، جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ وہ عصری ادب کے ہر میلان اور ہر کروٹ سے آشنا ہے، جو اردو رسائل پر قاموسی نظر رکھتا ہے، عہد قدیم سے لے کر عہد جدید تک کے تمام قابل توجہ شاعروں اور نثر نگاروں کی تحریروں کی نزاکتوں سے واقف ہے۔ خلیل صاحب اور اردو ادب لازم و ملزوم تھے۔ وہ

ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ انتہا پسند سیاسی نظریے اور اس کے یک رُخے اثرات سے بہت جلد آشنا ہوئے اور اُردو میں جدید رُجحانات کے لئے فضا سازگار بنانے میں اُن کا جتنا حصّہ ہے، شاید ہی کسی اور کا ہو، لیکن وہ جدیدیت کی انتہا پسندی کو بھی ادب کے لئے سمِّ قاتل سمجھتے رہے۔ ان کے ادبی نظریات سے میں نے ہمیشہ قربت محسوس کی ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنّیٰ رضوی، جو کسی زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے قریب رہ چکے ہیں، اکثر ان کی باتیں کرتے اور جب عصری ادب سے دلچسپی یا کتابوں اور رسالوں کے باب میں خوش سلیقگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ خلیل صاحب کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی لیتے تو مجھے غیر معمولی خوشی ہوتی۔ خلیل صاحب کا حافظہ، ان کا علم، ان کی شخصیت کی نرمی — ایسی خصوصیات تھیں، جنہیں پانے کی مجھے ہمیشہ خواہش رہی۔ مجھے چند ادبی شخصیتوں سے کسی نہ کسی اعتبار سے قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن خلیل صاحب کے نام کے ساتھ اپنا نام وابستہ دیکھ کر جو سکون مجھے ملا ہے، اسکی لذت ہی اور ہے۔

ابھی حال میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے دستِ راست اور عزیز دوست شہریار نے میرے ساتھ ایک مختصر قیام کے بعد اپنے ایک خط میں یہ جملے بھی لکھے ہیں:

> "سری نگر کا یہ سفر میرے لئے ایک یادگار بن گیا ہے اور اس کی وجہ صرف آپ کی ذات ہے۔ آپ سے مل کر، آپ کو دیکھ کر اور آپ کو برت کر خلیل صاحب کی یاد تازہ ہو گئی۔"

میں اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا Compliment، سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

● ۱۹۸۰ء

مظہر امام کی تصانیف

شعر

زخمِ تمنّا	[نظمیں، غزلیں]
رشتہ گونگے سفر کا	[" "]
پچھلے موسم کا پھول	[غزلیں]
بند ہوتا ہوا بازار	[نظمیں]

نثر

آتی جاتی لہریں	[تنقیدی مضامین]
آزاد غزل کا منظرنامہ	[تحقیقی اشاریہ]
جمیل مظہری	[مونوگراف]
اکثر یاد آتے ہیں	[یادداشتیں]

مظہر امام

ادب پبلیکیشنز، نئی دہلی